

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224590

UNIVERSAL
LIBRARY

(سلسلہ تہذیب نمبر ۲)

خمن از مطربے گو و را زید ہر کتر جو
کہ کس نکشود و کشاید بحکمت این معمارا

ہندوستان کی موسیقی

ادیب بے ہمتا مولانا مولوی محمد عبدالکلیم صاحب شری

کا
ایک مہسودہ لکچر جس میں اُس کی ابتدا اُس کے تغیرات اور
اُس کے مابین ترقی بڑی خوبی و وضاحت کے ساتھ بتائے گئے ہیں

جو
بڑودہ کی میوزک کانفرنس منعقدہ آخر مارچ ۱۹۱۶ء میں

پیش ہونے کے لیے

یہ چیز دو خاکسار محمد سراج الحق (حکیم) منیجر و پبلشر کے اہتمام سے

مارچ ۱۹۱۶ء میں

دکنڈاز پریس میں چھپ کے شائع ہوا



جن فنون کے ذریعہ سے جذبات انسانی کا ظہور ہوتا ہے

اُن میں سب سے زیادہ جس فن سے انسان نے کام لیا اور اکثر

لیتار ہوتا ہے وہ موسیقی ہے۔ فلاسفہ کا مقولہ ہے ”جن جذبات اُن

کے اظہار سے زبان و الفاظ عاجز رہ جاتے ہیں اُن کو نغمہ اپنے

سُرون اپنی لے اور اپنے زمزمون سے ادا کرتا ہے۔ اور ایسی خوبی

سے ادا کرتا ہے کہ نفس انسانی اُس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ اور روح

میں عجیب رقت و نرمی پیدا ہو جاتی ہے“ گانا انسان کی سرشت میں

داخل ہے۔ اور حیوانات تک اُس سے متاثر ہوتے ہیں۔ رجز خوانی

سے سپاہی کا حوصلہ بڑھتا ہے۔ پہنہاری گا گا کے اپنی نحت کو خوشگوار

بناتی ہے۔ مان بیٹے کی لاش پر بین کر کے دل کی بھڑاس نکالتی ہے۔

عاشق غزل سرائی میں فراق کا غم غلط کرتا ہے۔ بچہ مان کی لوری سُن سُن

کے سوتا ہے۔ آونٹ جُدی کے آننے پر مست خرامی کرتا ہے۔ گھوڑا سُن

کی آواز پر پانی پیتا ہے۔ اور سانپ بین کے لہرے پر جھبھو منے لگتا ہے۔

یہ سب خیر کئے، مگر سہ موسیقی کے مختلف کلاس ہیں۔

جو لوگ گانے کو حرام بتاتے ہیں اُن کی طبیعت بھی جب مزے

پر آتی ہے تو خلوت ہی میں بیٹھے بیٹھے ترنم کرنے لگتے ہیں۔ مگر باوجود اس ذوق و شوق اور رُحجان عام کے ہمیں یہ دیکھ کے بڑی حیرت ہوتی ہے کہ ایسے ضروری اور اہم فن کی طرف سے گوؤ کو اس قدر بے اعتنائی کیون ہے؟ فنون لطیفہ میں سے شاعری کی ترقی میں ہم ساعی ہیں۔ مصوری کی بھی اتنی قدر کرتے ہیں کہ نصاب تعلیم میں اخل کر لیا ہے۔ ایک بے پروا ہیں تو موسیقی کی طرف سے جو سب سے مہتمم بالشان اور انسانی جوش و جذبات کے ظاہر ہونے کا سبب سے زیادہ ضروری۔ قوی۔ اور موثر آلہ ہے۔

مگر ہماری اس بے حسی سے بھی موسیقی کو ایسا ضرر نہیں پہنچ سکتا کہ فنا ہو جائے۔ موسیقی کو فطرت نے ایجاد کیا ہے۔ اور وہی ہر شخص کو ایک مناسب حد تک اُس کی تعلیم بھی دے دیا کرتی ہے۔ وہ بے سیکھے جوش کے موقون پر نغمہ سرا بن جاتا ہے۔ اور سُری آواز سُن کے محفوظ ہوتا ہے۔ نغمہ سنج طور قدرت کا مکمل و دلکش ترین ارغنون ہیں۔ جو کئے اور سُرد و نون حیثیتوں سے ایک نہایت ہی اعلیٰ درجے کا نغمہ سُنا کے ہمیں مست و اند خود رفتہ بناتے ہیں۔ اور پھر اُسی نغمے کو ہم اپنے گلے کے سروں میں ڈھونڈنے لگتے ہیں۔

الغرض انسان کے جذبات فطری نے موسیقی کو ہر ملک

ہر سرزمین اور ہر قوم میں خود و طریقے سے پیدا کیا۔ مگر جن قوموں کے تمدن نے ترقی کی اور جنہوں نے علم و فضل میں نمود حاصل کی اُنہوں نے اپنی زبانوں میں اس فن کو بھی باضابطہ و مہذب بنالیا۔ اور اپنے ہنر سے نغمے کی قدرتی کشش اور زیادہ بڑھادی

جنی اسرائیل۔ مصری۔ آشوری۔ بابلی۔ یونانی۔ اور رومی سب نے اپنی اپنی باری میں اس فن کو ترقی دی۔ اور اپنا فرض ادا کیا۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ہماری موسیقی کیسی ہے؟ اور ہم نے اُس کے لیے کیا کیا ہے؟

ہندی موسیقی

جس طرح ہندوستان کی تاریخ تو ایک رازہ سر بستہ ہے مگر اُس کی تہذیب و شائستگی کا سب سے قدیم اور اعلیٰ و اکمل نمونہ یقینی ہے اُسی طرح بیان کا اگلا موسیقی بھی اگرچہ ایک عقدہ الاغیل ہے مگر اس میں کوئی شک نہیں کر سکتا کہ ہندوستان کی آریہ قوم نے موسیقی کو سب سے پہلے اور سب جگہ سے زیادہ ترقی دی تھی۔ اور اُسے بہت ہی اعلیٰ درجے کا مکمل و بے مثال فن بنادیا تھا۔ موسیقی کی تعلیم و تدریس کے ساتھ وابستہ تھی۔ اور گانا بجانا عبادت میں داخل تھا۔ شام وید کے بھجن گانے ادا کیے جاتے تھے۔ اُپ ویدون میں وہ بہ حیثیت ایک فن کے مرتب کی گئی۔ اور مقدس و خدا رس لوگوں کے لصاب تعلیم میں داخل ہوئی۔

مگر افسوس پُرانا میوزک لٹریچر دست برد زمانہ کی نذر ہو گیا۔ آج ہندوستان کے اُس عہد اولین کی کوئی ایسی تحریر نہیں موجود ہے جس سے پتہ لگایا جاسکے کہ اُس وقت کا موسیقی ہند کیا تھا؟ کیسا تھا؟ کیونکر ادا کیا جاتا تھا؟ اور اُس کے اُصول کیا تھے؟

ہمارے موجودہ فن موسیقی کی علت مادی و ہی عنصرین جو ہندوستان کے تمام تمدنی شعبوں کے عناصر واقع ہوئے ہیں اور وہ دونوں عناصر ہندو مسلمانوں کے علوم ہیں۔ اور انہیں

دونوں کی وقعت و اہمیت سے ہمارے موسیقی کی بھی قدر معلوم ہو سکتی ہے۔ اسی خیال سے ہم ان دونوں قوموں اور ان کی زبان کی موسیقی کی تاریخ جدا جدا بیان کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد حتی الامکان یہ بیان کریں گے کہ ان دونوں کے ملنے سے اس فن کی کیا صورت ہو گئی اور اب اُس کی کیا شان ہے۔

خاص ہندو
موسیقی۔

مسلمانوں کے آنے سے پیشتر ہندوؤں کا موسیقی کیسا تھا اس بارے میں سوا اس کے کہ بے گھڑ و تر و تسلیم کر لیا جائے کہ وہ بہت اچھا تھا اور نہایت مکمل تھا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے اس فن کی نوعیت پر اُس وقت کی کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔ وید کے پرانے گیت ہیں مگر خبر نہیں کہ اُن کا نغمہ کیا اور کیسا تھا۔ موسیقی پر سنسکرت کی سب سے پہلی کتاب ”رتناکر“ بتائی جاتی ہے جسے سارنگ دیونپنڈت نے بارہویں صدی عیسوی میں تصنیف کیا تھا۔ جب کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں آئے چار صدیوں کے قریب زمانہ گزر چکا تھا۔ اور شمالی ہند میں غوری سلطان حکومت کر رہے تھے۔

مگر اس سے بھی زیادہ حیرت کی یہ بات ہو کہ ”رتناکر“ کی موسیقی بھی آج دنیا میں کسی کے سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ اور نہیں کہا جاسکتا کہ ہمارے موجودہ موسیقی کو اُس سے کہاں تک تعلق ہے۔ ہمارے جدید قابل دستند مصنف موسیقی راجہ نواب علی خان صاحب رئیس اودھ اپنی کتاب ”معارف النغمات“ میں تحریر فرماتے ہیں ”افسوس ہے کہ اس وقت ہندوستان میں ایک شخص بھی ایسا موجود نہیں جو اس کتاب کو سمجھ

یا داکر سکتا ہو۔ یہاں تک کہ اس کتاب کے بعد جو گرتھ لکھے گئے اُن کے مصنفین نے بھی رتنا کر کے مضمون کو بخوبی نہیں سمجھا۔

اہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مذہب کی مربی گری سے یہاں رقص و سرود ہزار ہا سال پیشتر سے چلا آتا تھا۔ شمالی ہند میں ستھرا۔ اچودھیا اور بنارس اس کے بڑے مرکز تھے۔ اور دکن کے بڑے بڑے مندرون میں بھی اس فن کی بخوبی پرورش ہوتی رہتی تھی۔ آج سے ساڑھے بارہ سو برس پہلے جب عرب مسلمان سندھ میں آئے ہیں تو ملتان کے مندروں میں سیکڑ ہزار دن ناچنے گانے والی عورتیں موجود تھیں۔ اور گجرات کے بعض جاؤں کے ساتھ عورتیں راستے میں مجرئی کرتی جاتی تھیں۔

اس کے بعد ہندوستان میں موسیقی کے متعلق جو کچھ ہوا خالص ہندو کوشش کا نتیجہ تھا بلکہ ہندو مسلمان دونوں اُس میں شریک تھے۔ اور مجمعہ فن موسیقی کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس لیے اب ہم اسے اُنکی جگہ پر چھوڑ کے عربوں کی موسیقی کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

عربوں کی موسیقی کی تاریخ ظہور اسلام کے پچاس ساڑھ برس بعد سے شروع ہوئی ہے۔ جاہلیت عرب میں صد ہا سال پیشتر جرأتان کے لقب سے دو گانے والی رنڈیاں بتائی جاتی ہیں جو قوم قاد کے زمانے میں مکہ میں تھیں۔ مگر آنحضرت کے ظہور کے وقت تک عرب میں ایسی عورتوں کا پتہ چلتا ہی جن کا پیشہ گانا تھا اور مردوں کی صحبت شراب میں گایا بجایا کرتی تھیں۔ چنانچہ امیر حمزہ کی صحبت عیش میں ایک ایسی ہی عورت کے گانے کا واقعہ مستند روایات سے ثابت ہے۔ اسی قدر نہیں بلکہ ثابت ہوتا ہے کہ اُن میں راگ کا فن تھا۔ اور تین قسم کے راگ گائے جاتے تھے۔ را، نضب۔ جو پربوش نوجوانوں اور دشت نور د قافلون کا پُراثر اور

عربی موسیقی
جاہلیت میں

سیدھا سادھا گانا تھا۔ (۲) سناویہ دشوار اور پیچیدہ راگ تھا جس میں گلے بازی کی زیادہ مشق ہوتی۔ اور تانوں اور مینڈون وغیرہ کی اُس میں کثرت تھی۔ اور اُس کی بہت سی دھنین تھیں۔ (۳) ہر جہاں راگ کو صرف لوگوں میں جوش پیدا کرنے سے تعلق تھا۔ اس میں دل پر اثر کرنے والے سُرون سے کام لیا جاتا۔ اس بات کی خاص کوشش کی جاتی کہ دل کو براہِ نیگختہ کیا جائے۔ اور بے حسون کو جوش لاکے اُبھارا جائے۔ عرب کے تمام بڑے بڑے شہروں میں ان راگوں کا رواج تھا۔ خصوصاً اُن مقامات میں جہاں مشہور میلے ہوا کرتے۔ چنانچہ شہر ہائے مدینہ۔ طائف۔ خیبر۔ قذک۔ وادی القریٰ۔ دومۃ الجدل اور یمامہ۔ اس موسیقی کے لیے مشہور تھے۔ جہاں شرعاً عرب مجھون میں گانے کے اپنے اشعار سنایا کرتے۔ اور سُغنی اور مغنیہ عورتیں محفلوں میں گاتیں بجاتیں۔

عہد اسلام کی
موسیقی۔

ظہور اسلام کے وقت عورتوں کا دف بجا بجا کے گانا کثرت سے ثابت ہے۔ اور صحابہ کے زمانے ہی میں نامی گوئی پیدا ہونے لگے تھے۔ چنانچہ سب سے پہلا سُغنی اسلام بنی مخزوم کا ایک غلام طلویس تھا جس کی شہرت خلیفہ ثالث حضرت عثمان کے زمانے میں خوب ہو گئی تھی۔ اُسے ابتداءً عمر ہی سے گانے کا شوق تھا۔ اور ہر جہاں اور رمل کے راگوں میں استاد بے بدل مانا جاتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو نہایت منحوس بتایا کرتا۔ اور کہتا "جس دن میں پیدا ہوا اُسی روز رسول خدا صلعم نے سفر آخرت کیا جس دن میرا دودھ چھڑا گیا اُس دن خلیفہ اول حضرت صدیق اکبر کی وفات ہوئی۔ جس دن میں بلوغ کو پہنچا ہوں خلیفہ ثانی حضرت فاطمہ وقتی عظم

شہید ہوئے۔ اور جس دن میری شادی ہوئی اُس دن خلیفہ ثالث
حضرت عثمان ذی النورین کو لوگوں نے شہید کیا۔ اُسی عہد میں سعد
ابن ابی وقاص کا ایک غلام قند بھی خوب گاتا تھا۔ اُنہیں دونوں میں مہرج
اور ابن صیاد بھی تھے جن کا گانا مغویہ اور عبد اللہ بن جعفر طیار نے سنا۔
طویس کے شاگردوں میں سے تبعہ دلال اور نوامہ البغنی مشہور
ہوئے جن کے موسیقی کی مدینہ طیبہ میں اور بنی امیہ کے دربار میں
بڑی قدر تھی۔ یہاں تک کہ ابن ظنبرہ نام ایک مغنی یمن سے آئے چمکا
جو مہرج کے راگوں کا اُستاد مانا جاتا تھا۔

مگر عربی تمدن کے بڑھنے کے ساتھ ہی اس خود رو فن میں بھی
اصلاح و ترقی کی ضرورت پیدا ہوئی۔ اور اس کا آغاز یون ہوا کہ شہ
ہجری میں عبد اللہ بن زبیر کو کعبہ کی تعمیر کی ضرورت پیش آئی جس کے
لیے اُنھوں نے شام و ایران سے رومی اور عجمی معمار بلوائے۔ عجمی معماروں کا
قاعدہ تھا کہ عمارت بناتے وقت اپنے عجمی گیت گایا کرتے۔ اُن کا نغمہ
قبیلہ بنی نضج کے ایک خوش گلو جشی غلام سعید ابن مسیح کو بھلا معلوم ہوا۔
اُسے گانے کا شوق تھا۔ وہاں کے مذاق کے موافق فن موسیقی کو جانتا تھا۔
اور اکثر گایا کرتا۔ اُس نے غور و توجہ سے اُن عجمی معماروں کا گانا سنا۔
اُن کی دھنیں اپنے گلے میں اُتاریں۔ اور پھر جب عربی چیمرون کو اُن
دھنوں میں گایا تو ہر طرف واہ واہ ہونے لگی۔ اور بہن مسیح کو خیال
ہوا کہ خیر زبانون کی موسیقی سے میں اپنے نغمے کو ترقی دے سکتا ہوں۔
اُس کا یہ شوق دیکھ کے مالک نے آزاد کر دیا۔

لوگوں کی قدر دانی نے اُس میں طالب علمانہ ذوق پیدا کر دیا تھا۔

سفر کر کے ارض شام میں گیا۔ جہاں رومی و یونانی علوم پھیلے ہوئے تھے۔ اُن زبانوں کے مغنیوں سے ملا۔ اُن کے موسیقی کے اصول و قواعد سیکھے۔ چنگ دربط بجانا سیکھا اور ایران کی راوی۔ زبان ہاکہ ایرانی گویوں کا شاگرد ہوا۔ اُن کے غمون کی دھنیں سیکھیں اور آواز دنگیسا۔ اور شیرین و شکر کی دھنیں اپنے گلے سے ادا کیں۔ یون تری کر کے اور اصناف موسیقی میں درخور پیدا کر کے وطن میں واپس آیا تو عجیب چیز تھا۔ اور جہاں جاتا اُس کے شوق میں آنکھیں پھٹاٹی جاتیں۔ اور اُس کی قدر دانی میں لوگوں کا انہماک اس درجہ بڑھا کہ خلیفہ عبدالملک بن مردان کو رپوٹ ہوئی کہ ابن مسیح تمام نوجوان مدینہ کو غارت کیے ڈالتا ہے۔ اس پر اُس کی جائداد کی ضبطی کے ساتھ جواب دہی کے لیے دمشق میں حاضر ہونے کا حکم ہوا کشتان کشتان دمشق میں پہونچا تو وہاں کی سوسائٹی اور خود عبدالملک بھی اُس کے نغمہ کے والہ و شیدا ہو گئے۔ اور معافی کے ساتھ انعام و اکرام لے کے گھر واپس آیا۔

ابن مسیح کے بہت سے شاگرد و نون میں سب سے زیادہ نامور سرکچ اور غریض تھے۔ اور آخرین معبد بھی اُس کا شاگرد ہو گیا۔ یہ سب اپنے عہد میں سب سے بڑے استاد اور عہد ہم مثال مغنی مانے جاتے تھے جن میں معبد کا نام بہت چمکا۔ پھر اُسی قریب زمانے

عہ آریز ونگیسا ساسانی تاجدار خسرو پرویز کے مغنی تھے۔ اور شیرین و شکر اُسی عہد میں ایران کی نامور مغنیہ تھیں۔

مین رقیق۔ اور ابن عائشہ کے نفع کی شہرت ہوئی۔ اور اُن کی اس درجہ قدر کی جاتی تھی کہ بڑے بڑے ائمہ دین اور علماء فقہاتک نے اُن کا نغمہ سنا۔ اور یہ مطلق نہیں ثابت ہوتا کہ اس وقت کی سوسائٹی میں مغنیوں کا درجہ ایسا گرا ہوا تھا جیسا کہ فی الحال ہمارے یہاں ہے۔ بنی امیہ اور ابتدائی خلفائے بنی عباس کا دور اسی قسم کے صد ہا مغنیوں کو پیش کر رہا ہے جو اپنے فنون میں صاحب کمال تھے۔ جن میں حکم الوادی اور ابو کمال عزیز کے ایسے مغنی تھے۔ بنی عباس کے زمانے میں اس فن کو اور زیادہ ترستی ہوئی۔ اور مغنیوں کا درجہ بھی سوسائٹی میں بہت بڑھ گیا۔

رشید کے زمانے
کے مغنی

بارون رشید کے عہد میں شام و عراق اور عرب کے تمام مشہور شہزادے مغنیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ خود اُس کے دربار کے منتخب مغنی ابن جامع۔ اور ابراہیم موصلی اور ابن محرز تھے۔ اور مینون بڑے صاحب کمال مغنی تھے۔ ابراہیم وسعت معلومات فن میں بنیظیر تھا۔ اور ایجاد و اختراع کا بادشاہ مانا جاتا۔ ابن جامع کا گانا اس بلا کا تھا کہ ساری محفل کو اپنا والہ رشید بنا لیتا۔ بارون رشید نے ایک تہابک اُستاد مغنی سے پوچھا۔ ابن جامع کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ کہا۔ ”شہد کا پوچھنا ہی کیا؟ جب چکھے منہ نیٹھا ہو جائے گا؟“ پوچھا۔ اور ابراہیم کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے؟ جواب دیا۔ ”وہ ایک چمن ہے جس میں ہر رنگ کے پھول ہیں اور ہر طرح کی خوشبوئیں مہک رہی ہیں۔“ رشید نے کہا۔ ”تو اب ابن محرز کے بارے میں بھی اپنی رائے بتا دو۔“ عرض کیا۔ ”اُس کی شان یہ ہے کہ جو شخص جو مزا چاہتا ہو وہی اُس میں

لے لے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ انسان کے دل میں سے نکل
کے آیا ہے۔ اور دریافت کر لایا ہے کہ اُسے کیا چیز جلی معلوم ہوتی
ہے۔ اس عہد میں سب سے بڑا بربط نواز نزل تھا جو استاد
گوئون کے ساتھ جاتا۔ اور سب اُس کے کمال کے معترف تھے۔
اس موسیقی کو خالص عربی موسیقی نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ یہ وہ
فن تھا جسے خلفا کے دربار نے اپنے قومی نغمے میں ردی و
یونانی اور ایرانی موسیقی کو ملا کے ایک نیا معجون مرکب بنادیا تھا۔
اور کیا عجب کہ ہندوستان کے موسیقی کا کچھ نہ کچھ اثر بھی اُسی پر
ہو۔ ایسے کہ ہندوستان کے مختلف فنون کے ماہر برابر وہاں
جا کے رہتے اور بغداد کی صحبتوں میں ملتے جلتے تھے۔ یہ فن موسیقی
اُس وقت کی سوسائٹی میں اس قدر مقبول ہوا کہ اُن تمام ملکوں میں
جو خلافت کے زیرِ نگین تھے ایرانی موسیقی منسوخ ہو کے فنا ہو گئی۔
اور سندھ سے اسپین تک ہر شہر و قریہ میں یہی نغمہ گونج رہا تھا۔
اور بچے بچے کی زبان پر یہی دھنیں جاری تھیں۔

سوشل حیثیت سے اُس کی اس قدر عزت تھی کہ دربار
خلافت کے اکثر معزز ارکان اعلیٰ درجے کے موسیقی دان اور
مغنی تھے۔ صرف پیشہ ور گوئیے نہیں بلکہ بڑے بڑے اُمراء و پیشی
و ہاشمی شہزاد اور خاص خاندان خلافت کے اکثر شاہزادے اور
شاہزادیاں تک باکمال موسیقی دان مانے جاتے تھے۔ اور انھیں
عیب نہ لگایا جاتا تھا۔ خود رشید کی بہن علیہ اور اُس کا بیٹا ابراہیم
گانے کے مسلم استاد مانے جاتے اس کے ساتھ قلیہ کی پاکدامنی

مغنیوں کی
عزت

و دیندار۔ یہی کی بھی سجدہ تعریف کی جاتی تھی۔ اور ابراہیم کو تو سارے
بنی عباس نے بل کے چند روز کے لیے اپنا خلیفہ بنا لیا تھا۔

اس ذوق و شوق اور عام رجحان نے سیکڑوں ہزاروں
دُھنین پیدا کر دیں جو کسی نہ کسی مشہور مغنی کی طرف منسوب تھیں۔
اب مخارق اور علویہ کے پایے کے مغنی پیدا ہوئے جو اصناف
موسیقی پر پوری طرح حاوی تھے۔ ان دونوں نے صد ہائیں دُھنین ایجاد
کرنے کے علاوہ فارسی زبان کے گیتوں میں بھی وہی دُھنین قائم کرنا شروع کر دیں۔
فارسی کی پرانی موسیقی مٹ کے عربی موسیقی میں کھپ گئی تھی ان دونوں
مغنیوں نے موجودہ فارسی نغمہ کو زندہ کیا۔ اور انھیں کی کوشش اور جدت طرازی سے
عربی موسیقی فارسی میں منتقل ہوئی جو عربی کے دوش بدوش ترقی
کرنے لگی۔

متوکل کے زمانے میں (۲۳۱ھ سے ۲۳۶ھ تک) عربی موسیقی
کو بہت ہی نشو و نما ہوا۔ اُس عہد کے نامور مغنی تین تھے۔ تمیم اور
مشدد فن نغمہ کے استاد ان کامل مانے جاتے۔ اس کے بعد مقصد
باللہ نے جس کا عہد ۲۳۶ھ سے ۲۳۹ھ تک تھا خود فن موسیقی میں
کمال حاصل کیا۔ اور بڑے بڑے صاحب کمال گویے اپنے دربار میں
جمع کر لیے۔ پھر اُس سے بھی زیادہ ترقی عبد اللہ بن معتز نے دی
جو ایک یادگار زمانہ شاعر بھی تھا۔

اب عربی موسیقی کو سجدہ وسعت ہو گئی تھی۔ ہزاروں دُھنین
قائم ہو گئیں تھیں۔ جن میں اختلاف پڑنے لگا۔ اور شبہات پیدا ہوئے
کہ کون دُھن کس کی ایجاد ہے اور لوگوں میں باہم اختلاف پڑا۔

موجودہ فارسی
موسیقی

جس کی زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ فن موسیقی پر عربوں نے بیسیوں کتابیں لکھ ڈالیں۔ آخر الامر جو تھی صدی ہجری کے آغاز میں علامہ ابوالفرج اصفہانی نے اپنی مشہور کتاب آغانی تصنیف کی جو اتنی بڑی ضخیم کتاب ہے کہ اکیس جلدوں میں ختم ہوئی ہے۔ اس کتاب کا اہلی مقصد یہ ہے کہ بنی عباس کے زمانے میں جو سو دھنیں منتخب اور مقبول عام تھیں وہ بتا دی جائیں کہ کن ہیں۔ کیسی ہیں۔ کس کی ایجاد ہیں۔ اور ان کے بول کیا ہیں۔ اس میں مصنف پہلے وہ شعر لکھتا ہے جس میں دھن قائم کی گئی ہے۔ پھر اُس دھن کا حلیہ ایسے الفاظ اور اشاروں میں بتاتا ہے جن کو اب کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اس میں اُس مقبول راگ کا نام بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ کس انگلی سے کس وضع سے اور کس طرح مربوط کے کس تار سے کیونکر کام لے کے ادا کیا جائے۔ اس کے بعد شعر کے مصنف اور دھن قائم کرنے والے غنی و دونوں کی پورے پورے حالات زندگی بتا دیتا ہے۔ فی الحال یہ کتاب عربی علم ادب کی اعلیٰ درجے کی کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔ اور اُس سے صرف تاریخی فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ یورپ میں اس کی بڑی قدر ہوئی۔ نہایت اہتمام سے چھاپی گئی ہے۔ اور فرانس میں خدا جانے کتنی مدت کی محنت کے بعد اب اُس کا انڈکس تیار کیا گیا ہے۔

لیکن آغانی سے اب اور جس قسم کا فائدہ چاہے اٹھایا جائے۔ موسیقی میں کافی مدد نہیں لی جاسکتی۔ اس لیے کہ اُسکی اصطلاحیں سمجھنے والے ناپید ہیں۔ فونوگراف ان دنوں تھا نہیں

کہ گھون کے سُراپنی اصلی وضع میں محفوظ رکھے جاسکتے۔ جن گون سے وہ مُسر ادا ہوتے تھے فنا ہو گئے۔ اصطلاحی الفاظ رہ گئے جو نہ صحیح مُسر کی تصویر دکھا سکتے ہیں نہ لے کی۔ اگرچہ اُس میں فن موسیقی کے اصول و قواعد نہیں بتائے گئے ہیں جس کام کو دوسرے مصنفوں نے ادا کیا۔ مگر ضرورت ہے کہ آگاہی کی ذہنوں کے زندہ کرنے میں بھی دیسی ہی گھس کی جائے جیسی کہ رتناگر کے زندہ کرنے کے لیے تجویز کی جاتی ہے۔ لیکن یہ کام رتناگر کے زندہ کرنے سے بھی زیادہ دشوار ہے اگرچہ غیر ممکن نہیں۔ تاہم خوب یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستان کی موجودہ موسیقی کی تکمیل بغیر ان دونوں کاموں کے انجام دے نہیں ہو سکتی۔

اُن دونوں مسلمانوں میں فن موسیقی کا اس قدر رواج تھا کہ گو علمائے دین محدثین و فقہاء کو اُس کی طرف توجہ نہ تھی مگر جو علماء دینیات کے دائرے سے باہر قدم نکالتے موسیقی کی تعلیم کو بھی ضروری خیال کرتے۔ جس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کا سب سے بڑا حکیم اور فلسفی ابو نصر فارابی جو ”معلم ثانی“ کے اصل لقب سے لقب ہے۔ اسطو کے بعد اُس کا دوسرا درجہ بتایا جاتا ہے۔ اور مصنف افغانی کا ہم عصر تھا وہ حکیم و فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ہی اعلیٰ درجہ کا صاحب کمال مغنی بھی مانا جاتا ہے۔ موسیقی میں اُس کے کمال کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے :-

وہ ترک سپاہیوں کی وضع میں رہتا تھا۔ دشمنین پہونچا تو سیدھا وہاں کے فرمان روا شیخ الدولہ بن حمدان کے دربار میں پہونچا۔ اور بادشاہ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس وقت دربار میں بڑے بڑے

علما جمع تھے۔ سیف الدولہ نے اُسکی طرف حلف دیکھ کے کہا ”بیٹھ جائیے۔“
 کہا ”کہاں بیٹھوں؟ اپنے رُتبے کے مقام پر یا دربار کی مناسبت سے؟“
 جواب ملا ”اپنے رُتبے کے مقام پر بیٹھو“ یہ سنتے ہی ابونصر مند شاہی
 پر جا کے بیٹھ گیا۔ اور اس طرح پھیل کے بیٹھا کہ غور بادشاہ کے لیے بھی
 جگہ نہ رہی۔ یہ حرکت سیف الدولہ کو سخت ناگوار ہوئی ایک خاص
 زبان میں غلاموں سے کہا ”میں اس شخص سے چند سوالات کروں گا
 جس سوال کے جواب میں اسے عاجز دیکھنا ہے پھر چھ قتل کر ڈالنا“ ابونصر
 اُسی زبان میں کہا ”مگر حضور! اُسے قائم کرنے میں جلدی نہ کیا کریں“
 بادشاہ نے گہرا کے کہا ”کیا تم یہ زبان جانتے ہو؟“ کہا ”اسی زبان
 پر منحصر نہیں میں ایسی ایسی ستر زبانیں جانتا ہوں“ اب علما سے دربار
 سے مباحث شروع ہوئے۔ مگر جس کو کچھ پوچھا جواب سن کے دنگ
 ہو گیا۔ اور سب کو اقرار کر لینا پڑا کہ ہم اس سے پیش نہیں پاسکتے۔
 ان واقعات سے سیف الدولہ کو اُس کی قدر ہوئی تب تکلفی
 کی صحبت خاص میں لے گیا جہاں مغنیوں نے آ کے مجری شروع کیا۔ مگر
 ابونصر کی نکتہ چینیوں نے ہر مغنی کا ماطقہ بند کر دیا۔ بادشاہ نے پوچھا
 ”کیا آپ گانا بھی جانتے ہیں؟“ کہا ”جی ہاں جانتا ہوں“ یہ معلوم ہونے کے
 بعد سب نے اصرار شروع کیا کہ ”کچھ گائے“ فسانے لگے۔ ابونصر نے جیب سے
 چند لکڑیوں کو نکال کے جوڑا۔ اور پھر ان پر تار چڑھا کے کسے۔ یوں
 ایک جیسی بربط تیار کر کے سُراگئے۔ اور اُس پر مٹر چھڑکے جو گانا
 شروع کیا تو سارا دربار عیش عیش کر گیا۔ اس موقع پر اُس نے صرنا
 تین رگ گائے۔ پہلے رگ میں تمام حاضرین کو جوش مسرت سے ہنساتا رہا۔

موسیقی میں اُن کا
 کمال

دوسرے مین ساری محفل کو رلا دیا۔ اور تیسرے مین سب پر ایسی غنڈ
 طاری ہوئی کہ بادشاہ اور کل حاضرین غافل سو گئے۔ اُنھیں سوتا چھوٹے
 ابو نصر جیکے سے چلا گیا۔ اور بیداری کے بعد سیف الدولہ نے جب تک
 اُسے بلانے اپنا رفیق نہ بنا لیا چین نہ آیا۔ ہمارے بیان قانون نام
 کا جو ساز موجود ہے اسی ابو نصر فارابی کی ایجاد ہے۔

ابن سینا

ابو نصر کے وفات کے بعد ابو علی ابن سینا پیدا ہوا جو مسلمانوں
 کا دوسرا موسیقی دان حکیم و فلسفی ہے۔ اُس نے اپنی مشہور و معروف
 کتاب شفا میں فن موسیقی کو شرح و بسط کے ساتھ بتایا ہے۔ اگرچہ
 اُس کے گانے بجانے کا کوئی واقعہ ہم نے نہیں سنا ہے۔

اس عربی و عجمی موسیقی کو برت کے دکھانے اور ادا کرنے والا
 تو مجھے ہندوستان بھر میں کوئی نہیں نظر آتا۔ مگر اُس کی تقسیم اور
 اُس کے نعمات کی باقاعدہ فہرست میں پیش کیے دیتا ہوں جس سے
 اس بات کا اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کس قدر وسیع فن ہے۔ اور
 کتنی کوششوں کے بعد اس درجے کو پہنچا ہو گا۔

اس اسلامی
 موسیقی کے راگ
 راگنیاں

اُن نوگون نے آسمان سے بارہ بُرجوں کے لحاظ سے ۱۲ مقام
 یا اصلی راگ مقرر کیے ہیں۔ (۱) راہادی۔ (۲) حسینی۔ (۳) راست
 (۴) حجاز۔ (۵) بزرگ۔ (۶) کوچک۔ (۷) عراق۔ (۸) لڑا۔ (۹)
 صفاہان۔ (۱۰) عشاق۔ (۱۱) نہنگلہ۔ (۱۲) بوسلیک۔ ان مقاموں
 کے نیچے اور اوپر کے سُردوں کے لحاظ سے اُنھوں نے ہر ہر راگ کو
 دو دوشعبوں پر تقسیم کیا ہے۔ اور یوں ۱۲ راگوں کے ۲۴ ہو گئے ہیں
 جو رات دن کے ۲۴ گھنٹوں کے مطابق ہیں۔ ہر شعبہ کا جدا نام ہے۔ اور

اُس کے ماتحت متعدد راگنیاں ہیں۔

(۱) راہادی کا پہلا شعبہ نوروز عرب ہے جس کی چھ راگنیاں ہیں اور دوسرا شعبہ نوروز عجم ہے۔ اُسکی بھی چھ راگنیاں ہیں۔

(۲) حینئی کا پہلا شعبہ دو گاہ ہے جس کی ۲ راگنیاں ہیں اور دوسرا شعبہ تاجر ہے جس کی ۸ راگنیاں ہیں۔

(۳) راست کا پہلا شعبہ پنج گاہ ہے۔ جس کی ۵ راگنیاں ہیں اور دوسرا شعبہ تبرقع ہے جس کی ۲ راگنیاں کا شمار مجھے نہیں معلوم۔

(۴) حجاز کا پہلا شعبہ تہ گاہ ہے جس کی ۳ راگنیاں ہیں اور دوسرا شعبہ حصار ہے جس کی ۸ راگنیاں ہیں۔

(۵) بزرگ کا پہلا شعبہ ہمایون ہے اور دوسرا نہفت۔ اس کی راگنیوں کی بھی تفصیل نہیں معلوم۔

(۶) کوچک کا پہلا شعبہ رکب ہے جس کی ۶ راگنیاں ہیں اور دوسرا شعبہ بیات ہے جس کی ۵ راگنیاں ہیں۔

(۷) عراق کا پہلا شعبہ تحالف ہے جس کی ۵ راگنیاں ہیں اور دوسرا شعبہ مغلوب جس کی ۸ راگنیاں ہیں۔

(۸) نوا کا پہلا شعبہ نوروز خارا ہے جس کی ۵ راگنیاں ہیں اور دوسرا شعبہ نامور ہے جس کی ۶ راگنیاں ہیں۔

(۹) صفاہان کا پہلا شعبہ تبریز ہے جس کی ۵ راگنیاں ہیں اور دوسرا شعبہ نشاپور ہے جس کی ۶ راگنیاں ہیں۔

(۱۰) عشاق کا پہلا شعبہ زابل ہے جس کی ۳ راگنیاں ہیں اور دوسرا شعبہ آوج ہے جس کی ۸ راگنیاں ہیں۔

(۱۱) زنگلہ کا شعبہ چار گاہ ہے جسکی ہر انگلیان ہین اور دوسر شعبہ غزال ہے جس کی ۵ انگلیان ہین۔

اس طریقہ سے اس عرب و عجم کی موسیقی میں (۱۲) راگ (۲۲) شعبہ اور (۱۲۲) راگینوں سے کچھ زیادہ ہو میں۔

ان سادے بسیدہ راگون کے علاوہ ان لوگون نے مرکب نعمہ بھی ایسے بنائے ہین جو دود و راگون سے مل کے خاص ترتیب سے بنتے ہین۔ یہ ظاہر ان راگون کی تعداد زیادہ ہونی چاہیے مگر اُنھوں نے چھ ہی بتائے ہین۔ جن کو اپنی اصطلاح میں وہ آہنگ کہتے ہین۔ اور وہ حسب ذیل ہین۔ (۱) سلک (۲) گردانیہ (۳) نوروز (۴) گوشت (۵) مارہ (۶) شہناز۔ اس کے علاوہ اُس موسیقی میں بعض اور خاص دھنین بھی ہین جن کو وہ گوشہ کہتے ہین۔ اور سب کے جدا جدا نام ہین جو ایرانی و عربی مذاق کی ہم آہنگی اور ان کے باہم ہمکنار ہونے کا ثبوت دیتے ہین۔ ان گوشوں کا شمار ان کی جستجو و سعی سے ۸ تک ہو چکا ہے۔

اُس کے نغموں
کے اوقات

ان راگون کے اوقات بھی مقرر ہین۔ رہاوی کا وقت پوٹھنے کے وقت سے طلوع آفتاب تک۔ حسینی کا بہر دن چڑھے تک۔ عراق کا دوپہر تک۔ راست کا ٹھیک دوپہر کو۔ گوچک کا بہر دن رستہ تک۔ توسلیک کا عصر کے وقت۔ عشاق کا بالکل آخر روز میں۔ زنگلہ کا بہر آٹ گئے تک۔ بزرگ کا اُس کے بعد کچھ دیر تک۔ اور نوا کا آدھی رات کو ہے۔

نئے اور تال بھی اُس موسیقی میں کمال کے درجے تک پہنچے ہوئے تھے۔ اس لیے کہ اُس میں ۷ تال ہین۔ جو مخمس۔ ترک۔ ضرب

دو یک دغیرہ ناموں سے یاد کیے جاتے ہیں۔

غرض یہ موسیقی تھا جس کو مسلمان اپنے ساتھ لے کے ہندوستان میں آئے۔ اُن کا آخر الذکر مصنف موسیقی ابو علی بن سینا محمود غزنوی کا معاصر تھا۔ اگرچہ یقیناً اُس سے بہت پہلے عربوں کے ساتھ متعدد مغنی سندھ میں آئے ہوں گے۔ مگر وادی گنگا تک مسلمانوں کے پہنچنے کا آغاز محمود غزنوی کے عہد سے ہوا ہے۔ اور جو اسلامی معاشرت ہندوستان میں قائم ہوئی اُس کی بنیاد بھی اُسی وقت سے پڑنا شروع ہوئی تھی۔ لہذا ہم اس فن کے بیان آنے کی تاریخ اُنکی زمانے سے قائم کرتے ہیں۔

محمود کے دربار میں جس طرح شعرا کی کثرت تھی مغنیوں کی بھی ہو گئی۔ مگر ہمیں اس وقت اس کے زمانے کے نہ کسی مغنی کا نام معلوم ہو اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُسے موسیقی کا کس قدر شوق تھا۔ اُس کے بعد سلاطین غزنویہ نے بھی بہت کچھ عیش کیا۔ مگر اُن کی صحبت ہمارے طرز میں اپنے اسلامی موسیقی کو زیادہ رسوخ حاصل ہو گا۔ کیونکہ اُس وقت تک مسلمان ہندوستان کے مذاقِ غنا سے بالکل نا آشنا تھے۔ گو اُس کے جاننے کی بحد ضرورت تھی۔

اس ضرورت کو زیادہ مشائخ صوفیہ نے آگے پورا کیا۔

صوفیوں کی موسیقی

جنھوں نے ہندو مسلمان دونوں گروہوں میں اپنے آپ کو مقبول بنا کے گانے بجانے کو ایک حیثیت سے عبادت بنادیا۔ اور قوالی سنتے ہوئے بغداد سے دہلی میں آ پہنچے۔ چنانچہ قاضی حمید الدین ناگوری جو ایک زمانے میں بغداد کی صحبت ہمارے سماع کے رکن اعظم تھے دہلی میں آئے

التمش کو شوق
موسیقی

اور یہاں آ کے بھی وہی حال و قال کی محفل گرم کر دی۔ علمائے
اس پر اعتراض کیا۔ اور فرمان روا سے وقت سلطان شمس الدین التمش
کے دربار میں شام کی ہو گئے۔ سلطان نے قاضی صاحب کو علما کے
سامنے اپنے دربار میں بلوایا۔ کسی عالم نے سرور بار آپ سے سوال
کیا کہ ”سماع کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ جائز ہے یا ناجائز؟“
قاضی صاحب نے کہا ”اہل قال کے لیے حرام ہے اور اہل حال کے
لیے حلال“ پھر سلطان شمس الدین التمش کی طرف متوجہ ہو کے کہا
”آپ کا یہ عروج اور یہ سلطنت و دولت اُس ایک شب کی خدمت
محفل سماع کا صلہ و انعام ہے جب آپ رات بھر گلگیر ہاتھ میں لیے
شمع کا گل لیتے رہے تھے“ سلطان نے سوچا تو یاد آیا کہ واقعی بغداد
میں اپنے غلامی کے زمانے میں وہ ایک صحبت سماع میں رات بھر
ادب سے کھڑا شمع کی گلگیری کرتا رہا تھا۔ اور اُس صحبت میں یہ صاحب
باطن قاضی صاحب بھی موجود تھے۔ اس واقعہ کا التمش پر بڑا اثر پڑا۔
علما کو رخصت کر دیا۔ ایوان شاہی میں صحبت حال و قال مرتب کی گئی۔
اور خاص دربار میں حال آنے لگے۔

یہی زمانہ ہے جب سے مسلمان فرمان روا یا ہندو موسیقی کے
مرتب بنے۔ بڑے بڑے مغنی درباروں میں جمع ہونے لگے۔ اور مشائخ
حیثیت نے سماع و غنا کو اپنے پاکبازی کے مشاغل میں شریک کر لیا۔
اسی شوق کا اثر تھا کہ التمش کے بیٹے رکن الدین فیروز شاہ کو موسیقی
کا بے انتہا شوق ہو گیا۔ اُس کے دربار میں مغنیوں کی قدر بہت
بڑھ گئی۔ اطراف و جوارب سے اور دُور دُور سے بڑے بڑے گویے

فیروز شاہ

اور اعلیٰ درجہ کی مغنیہ و رقاصہ عورتیں اُس کی محفل میں آکے جمع ہو گئیں۔ اور بادشاہ کا انہماک و توغل اس فن میں اس قدر بڑھا کہ ایک ہی سال کے اندر ۳۴ لاکھ روپے مطابق سلسلہ ۶ میں اُس نے اپنی سلطنت اس شوق پر قربان کر دی۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ رشتہ کار کو تصنیف ہوئے چند گنتی کے برس ہوئے ہوں گے۔ اب یہ بھی نہ تھا کہ دربار میں فقط عجیب مغنی ہوں نہیں زیادہ تر ہندوستانی گوئیے تھے۔ اس لیے کہ مرد ہی نہ تھے گانے والی عورتیں بھی تھیں۔ اور کثرت سے تھیں جو ہندوستان کے سوا باہر کی نہیں ہو سکتیں۔ وہ سب یقیناً اُسی موسیقی میں دخل رکھتی ہوں گی جو رشتہ کار میں مدون کی جا چکی تھی۔

معز الدین کیقباد

۶۸۵
اس کے پچاس برس بعد معز الدین کیقباد کے زمانے میں جوہر میں تخت پر بیٹھا تھا دربار دہلی میں اور اُس کی وجہ سے سارے ہندوستان میں موسیقی کا شوق اور بڑھ گیا۔ کیقباد کو گانے کا بڑا شوق تھا۔ اور گانے والے اور گانے والیاں جن کی ہندوستان میں اُن دنوں بڑی کثرت بتائی جاتی ہے سب طرف سے سمت کے دہلی میں جمع ہو گئی تھیں۔ چنانچہ یہی شوق اُس کے لیے بھی زوال دولت کا باعث ہوا۔

اُس کے دو ہی برس بعد خلجیوں کا زمانہ شروع ہوا۔ اور جلال الدین فیروز شاہ خلجی سریرِ آراء سے سلطنت ہوا۔ وہ اگرچہ عیش پرست نہ تھا مگر موسیقی کا اُسے بھی شوق تھا۔ اور اُس کے دربار کے نامور مغنی محمد شاہ چنگی، فتوحا، نصیر خان۔ اور بہروز تباہے جاتے

جلال الدین خلجی کے دربار کے گوئیے

ہیں۔ یہ لوگ اگرچہ مسلمان تھے مگر اُن کے نام بتا رہے ہیں کہ ہندوستان
ہی کی سوسائٹی میں اُن کا نشوونما ہوا تھا۔

علامہ الدین خلجی

علامہ الدین خلجی جو ۱۲۹۵ء میں تخت نشین ہوا اگرچہ اپنے سارے
عہد سلطنت میں فوج کشی میں مصروف رہا۔ اور کبھی اُسے اطمینان
سے بیٹھنا نہیں نصیب ہوا۔ مگر اُسے بھی موسیقی کا بے انتہا شوق تھا۔
اور بقول فرشتہ اُس کے دربار میں مطربوں غزلخوانوں اور رباب
نشاط کی اس قدر کثرت تھی کہ بیان نہیں ہو سکتا۔

اب مسلمان شمالی ہند سے قدم بڑھا کے دکن میں پہنچے۔ اور
سارنج سے بوضاحت ثابت ہوتا ہے کہ دکن میں بمقابل شمالی ہند کے موسیقی
کا رواج زیادہ تھا۔ وہاں سب سے بڑا دربار بیجا نگر کا تھا۔ جو کمالات
موسیقی کا بہت بڑا مرکز معلوم ہوتا ہے۔ اُس زمانے میں گلبرگہ میں ہمنیوں کی
سلطنت قائم ہو چکی تھی اور سنہ ۱۴۰۰ء میں راجہ بیجا نگر سلطان فیروز شاہ
ہمنی کے مقابلہ کو زبردست لشکر لے کے چلا اور دریائے کرشنا کے کنارے
خیمہ زن ہو گیا۔ راجہ کا راج کنور (دوئی عہد) بھی ہمراہ تھا۔ ایک
رات کو اُمراء دربار ہمنی میں سے قاضی سراج چندر فقا کے ساتھ
ہندو بھیس کر کے دریا پار ہو گئے۔ وہاں ایک مغنیہ رنڈی کے پاس
گئے جو ہندو فوج کے ساتھ تھی۔ اُس پر بید عشق ظاہر کیا۔ اور وہ
زیور پہن کے اور بناؤ سنگھار کر کے راج کنور کے وہاں مجرے کو حلی تو
مناضی صاحب نے بے انتہا بیتابی و بقراری ظاہر کی۔ اور کہا بغیر تھاپے
مجھے عبرت نہیں آ سکتا۔ اُس نے حذر کیا۔ اور اپنی مجبور بی ظاہر کی۔ تو اُنھوں
نے کہا مجھے بھی ساتھ لیتی چلو۔ وہ بولی وہاں میرے ساتھ سوا ساز نہ دے

بیجا نگر میں موسیقی
کی ترقی

اور کوئی نہیں جاسکتا۔ اُنھوں نے کہا » تو یہی کام مجھ سے لو « اُس نے امتحان لیا تو اُنھیں گانے بجانے میں ایسا باکمال پایا کہ بولی آپ کا سا سا زندہ جھلا کسے نصیب ہو سکتا ہے؟ آپ شوق سے چلین۔ چنانچہ اسکی سنگت میں قاضی صاحب دلی عہد کی صحبت نشاط میں پہونچے اور عین مجہرے کے اندر موقع پاتے ہی شاہزادے کو مار ڈالا۔ ساتھ ہی رفیقوں نے غل مچا کے شکر گاہ پر یورش کر دی۔ اور اُن کا شور مین کے سارے بھنی شکر چڑھ آیا۔

مسلمان علما میں
کمال موسیقی

اس واقعہ سے دیبا نگر میں رقص و سرود کی گرم بازاری کے ساتھ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اُس وقت مسلمان بیان کی موسیقی سے کس قدر مانوس و آگاہ ہو گئے تھے؟

دیبا نگر کے مرکز کمال موسیقی ہونے کا ثبوت پر تھال کے واقعہ سے بھی ملتا ہے۔ جو سنہ ۱۱۵۷ھ کا واقعہ ہے۔ دیبا نگر کا ایک برہمن جو موسیقی میں کمال رکھتا تھا کاشی کے تیرتھ سے واپس آ کے دکن کے شہر مکرل میں ٹھہرا جو دولت بہمنیہ کے زیر نگیں تھا۔ بیان وہ ایک سنار کے گھر میں اُتر ا۔ اُسی سنار کی لڑکی پر تھال تھی جس نے خلاف رواج اس برہمن سے پردہ کیا۔ برہمن نے پردے کا سبب پوچھا تو سنار نے کہا اس لڑکی کی عجیب حالت ہے۔ مسلمان عورتوں کی طرح پردہ کرتی ہے۔ اور کہیں شادی منظور نہیں کرتی۔ برہمن نے دم دلا سا دے کے اپنے سامنے بکایا۔ اُس کی صورت دیکھی۔ اور اُس کے حسن و جمال پر حیران رہ گیا۔ پھر اُس پر کچھ ایسا مہربان ہوا کہ وہیں ٹھہر گیا۔ اُسے موسیقی کی تعلیم دی۔ اور دیبا نگر واپس جا کے راجہ سے اُس لڑکی کے حسن و جمال

پر تھال کا واقعہ

کی تعریف کی۔ راجہ سنتے ہی عاشق ہو گیا۔ اور برہمن سے التجا کی کہ جس طرح بنے اُسے میری رانی بنا کے میرے محل میں داخل کر دو۔ برہمن نے وعدہ کیا۔ اور کچھ زور لے کے خوش خوش مڑکل میں آیا۔ پرتھال کے مان باپ کو راجہ کا پیام دے کے راضی کیا۔ اور قصد کیا کہ منگنی کے طریقے سے وہ زور پر پرتھال کو نبھا دے۔ مگر لڑکی نے پہننے سے قطعاً انکار کیا۔ اور کہا، اس بارے میں آپ دخل نہ دیں۔ راجہ کے زور میں خل ہو کے میں گھر بار اور مان باپ کو نہیں تھج سکتی۔ میری قسمت میں کچھ اور ہی ہے۔ جس کا انتظار کر رہی ہوں۔ اور اُسے خواب میں دیکھ چکی ہوں۔ برہمن مایوس ہو کے واپس گیا۔ مگر راجہ کے دل میں وہ شوق کی جو چنگاری ڈال چکا تھا وہ کیسے بجھتی؟ آمادہ ہو گیا کہ خود ہی جا کے پرتھال کو زبردستی پکڑ لائے۔

ان دنوں دریائے ینگ بھدرا بہمنی اور بیجا نگری سلطنتوں کی حد فاصل تھا۔ راجہ ایک معتد بہ لشکر لے کے دریائے اتر اور آمدھی کی طرح لوٹتا مارتا مڑکل کی طرف چلا کہ بہمنیوں کو خبر مہنے سے پہلے ہی مڑکل پر حملہ کر کے اپنی محبوبہ کو پکڑ لے جائے۔ مگر پرتھال راجہ کی قسمت میں نہ تھی۔ وہ جو لوٹتا مارتا چلا تو اُس سے پہلے اُس کی خبر مڑکل میں پہنچ گئی۔ اور کل بستی والے اپنی جان لے لے کے بھاگے۔ جن میں وہ سناہ اور اُس کا خاندان بھی تھا جو اپنے ساتھ پرتھال کو بھی لے کے کہیں فائب ہو گیا۔ راجہ نے پونج کے لاکھ سر مارا گوہر مراد ہاتھ نہ آیا۔ اور ناکام واپس گیا۔ اپنی سرحد کے قریب پہنچا تھا کہ بہمنی لشکر پہنچ گیا۔ اور اُسے اپنے دار السلطنت ہی میں بھاگ کے پناہ لینا پڑی۔

جب بہمنی سلطان کو راجہ کے اس حملہ کا اصلی سبب معلوم ہوا تو
پر تھال کو گلبرگہ میں بلوایا۔ اور اپنے بڑے بیٹے حسن خان کے
ساتھ بڑی دھوم دھام سے اور شانہ اہتمام سے شیشہ میں
اُس کی شادی کر دی۔ اور یہی پر تھال کا خواب تھا۔

اس واقعہ کے چھتیس برس بعد ۱۲۵۴ھ میں مولانا کمال الدین
عبدالرزاق تیمور لنگ کے بیٹے شاہ رخ مرزا کے ایلچی بن کے بجانگر
کے دربار میں آئے تو بتاتے ہیں کہ شہر میں گانے والی رنڈیوں
کی بے انتہا کثرت تھی۔ شہر کے ہر بچا ملک پر اُن کے محلے تھے۔ اور ایک
محلہ شہر کے بیچ بیچ میں تھا۔ یہ رنڈیاں راجہ اور دیگر امرا کی مخلون
میں مجبوری کیا کرتی تھیں۔ اور راجہ کی خوش تدبیری اُن سے انتظامی
امور میں فائدہ اُٹھاتی تھی۔

بجانگر ہی نہیں اُن بلاد دکن میں بھی جو مسلمانوں کی قلمرو
میں شامل ہو چکے تھے موسیقی کا بہت چرچا تھا۔ چنانچہ جس زمانے میں
بجانگر کی مذکورہ بالا حالت دکھائی گئی ہے۔ اُس سے تقریباً ایک صدی
پہلے سلطان محمد تغلق کے عہد میں (جو ۱۲۵۰ء سے ۱۲۵۶ء تک ہوا)
مغربی سیاح ابن بطوطہ اپنے سفر نامے میں دو گڈھ کے اندر جس کا محمد تغلق نے دولت آباد
نام رکھ دیا تھا اور باب نشاۃ کا ایک مخصوص بازار بتاتا ہے۔ وہ
لکھتا ہے: "اس شہر میں مغنیوں اور غنیہ عورتوں کا ایک بازار ہے جو
جو طرب آباد کہلاتا ہے اور تمام بازاروں سے زیادہ بارونق
ہے۔ اُس میں سڑک کے کنارے کنارے بہت سی دکانیں چلی گئی ہیں۔
ہر دکان کے پیچھے مکان ہے جس کا دروازہ ایک گلی میں ہے۔"

دولت آباد کا محلہ
طرب آباد

اس دکان میں پرتکلف فرش بچھا رہتا ہے اور اُس کے بیچ بیچ میں ایک بڑا سا ہندو لایا ہوتا ہے۔ اُس میں مغنیہ عورت بناؤ سنگھار کر کے بیٹھتی یا لیٹ جاتی ہے اور اُس کی لونڈیاں اُس ہندو لے کو جھلاتی رہتی ہیں۔ بازار کے بیچ میں ایک بڑا بھاری بُرج بنا ہوا جس میں مغنیوں کا چودھری ہر جمعرات کو نماز عصر کے بعد آ کے بیٹھ جاتا ہے۔ اُس کے غلام اور خدام سامنے دست بستہ کھڑے رہتے ہیں۔ اور گانے والیوں اور مغنیوں کے طائفے کے بعد دیگرے آ کے اُس کے سامنے مجرئی کرتے ہیں۔ مغرب کے وقت تک رقص و سرود کی محفل گرم رہتی ہے۔ اور آفتاب کے غروب ہوتے ہی وہ اُٹھ کے چلا جاتا ہے۔ اس بازار میں متعدد مسجدیں ہیں۔ جن میں ماہ مبارک رمضان میں تراویح ہوتی ہے۔ بعض ہندو راجہ جب اُدھر سے گزرتے ہیں تو اس بازار کے بُرج میں اُترتے۔ اور مغنیہ عورتوں کا گانا سنتے ہیں۔ بعض مسلمان بادشاہوں نے بھی اس بازار اور اس بُرج میں بیٹھ کے رقص و سرود سے لطف اُٹھایا ہے۔

محمد تعلق کا داروغہ
ارباب نشاط

ابن بطوطہ ہی نے یہ بھی بتایا ہے کہ محمد تعلق کے دربار کا سب سے بڑا گویا اور اُس کا داروغہ ارباب نشاط امیرمس الدین تبریزی تھا اور کل ارباب نشاط عام اس سے کہ مرد ہوں یا عورتیں سب اُس کے ماتحت اور تابع فرمان تھے۔ جن میں زیادہ تر ہندوستان ہی کے مغنی اور مغنیہ عورتیں ہوں گی۔

ان واقعات
کے نتائج

ان واقعات سے اول تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دولت آباد کا وہ بازار دراصل ہندوؤں کے زمانے سے قائم تھا۔ جس سے راجہ لطف

اٹھایا کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے آنے کے بعد اُس میں
مسلمان گویتے بھی پیدا ہو گئے اور اُن کی اس قدر کثرت ہو گئی
کہ اُن کے لیے کئی مسجدوں کے تعمیر ہونے کی ضرورت پیش آئی۔
پھر یہ کہ وہاں کے موسیقی سے مسلمان اس قدر مانوس
اور واقف ہو گئے تھے کہ مسلمان بادشاہ ہوں تک کو اُس میں
جا کے گانا سننے کا شوق ہوا۔ جو تھے یہ کہ دربار کا سب سے بڑا
مغنی ایک ایرانی الاصل مسلمان تھا۔ اور کل ارباب نشاط اُس کے
مطیع و منقاد تھے۔ پانچویں یہ کہ مغنیوں کا سردار اور داروغہ ارباب
نشاط اتنی عزت رکھتا تھا کہ ”امیر“ کے لفظ سے یاد کیا جاتا تھا۔

یہ سب باتیں تصدیق کر رہی ہیں کہ دکن میں موسیقی کا فن

زیادہ ترقی پر تھا۔ اور ہندوستان بھر میں یہاں کی قدیم موسیقی
پر عجیبی موسیقی کا اثر پڑے ایسے اسباب پیدا ہو گئے تھے جو بے نتیجہ
رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ یہ غیر ممکن ہے کہ جس طرح فحار ق اور علویہ
نے عربی کی دھنین فارسی کے گیتوں میں منتقل کیں اُسی طرح ہندوستان
کے مسلمان بادشاہوں کے مغنیوں نے اپنے ملک اور وطن کی دھنین
ہندوستان کے گیتوں میں نہ پیدا کی ہوں۔ یہی استاد تھے جنھوں نے
مسلمانوں اور ہندوؤں کے فن موسیقی کو ملا جلا کے ایک نئی موسیقی
پیدا کر دی۔ جس کے دونوں گروہ والد و شیدا تھے۔ اور اسی میل
جول کی برکت تھی کہ عجیبی موسیقی کے عام پسند راگون میں سورنور
زنگولہ اور تھارہ ہندی موسیقی میں شامل ہو کے نور و چکا۔ جگلا۔
اور تھج کے ناموں سے مشہور ہوئے اسی قدر نہیں سمجھا جاتا ہے کہ

دونوں موسیقیوں کا
مل کے نئی موسیقی ہندی

زلیف - شامانہ - درباری - اور صنّاع (کھماچ) بھی ہمارے بیان اُسی موسیقی سے آئے ہیں۔ ہمارے مکرم مصنف موسیقی راجہ نواب علیخان صاحب یہ قیاس قائم کرنے میں کہ عیلمی لین دین کسریٰ کے زمانے میں ہوا بہت دُور نکل گئے۔ کسریٰ کے زمانے کی موسیقی آج دنیا میں موجود نہیں اور نہ کوئی اُس کے کسی ایک راگ کا بھی نام جانتا ہے۔ یہ سب راگ اُس عربی موسیقی کے ہیں جو مسلمانوں کی پیدا کی ہوئی ہے۔ پارسیوں کی عید کا لحاظ کر کے لفظ نور و نہ کا وجود چاہیے کسریٰ کے زمانے میں بتا دیجیے۔ مگر حجاز تو خالص عربی ہے۔ اور جس راگ کا نام نور و نہ ہے وہ خالص عباسی ہے نہ ساسانی۔

اس میں ہمارے خیالات زیادہ عربی موسیقی کا اثر ہے۔

یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ اُس عربی موسیقی کا اثر ہندوستانی موسیقی پر اتنا ہی پڑا جتنا کہ مذکورہ چند نغموں کے ناموں سے ظاہر ہوتا ہو۔ میل جول کی جو شان رہی ہے اور صدیوں تک جیسا عظیم الشان کون و فساد ہوتا رہا ہے اُس سے قطعی طور پر یہ رائے قائم کیجا سکتی ہے کہ ہمارے علم اور قیاس سے بدرجہا زیادہ اثر عرب و فارس کے اُس فن کا ہمارے موجودہ فن پر ہوا ہوگا۔ اور اس کا نفرنس کے اہم ترین مقاصد میں یہ بھی ہونا چاہیے کہ ان تمام اثرون کا پتہ لگائے۔ ایران کے باکمال مغنیوں کو تلاش کر کے اُن کی تمام دھنین بیان کے مبصر مغنیوں کو سنائی جائیں۔ اور دیکھا جائے کہ وہ ان کے کس راگ کے سر بیان کے کس راگ سے ملتے ہیں۔ اور جن راگوں کی نسبت ہمارا خیال ہو کہ اُس عربی موسیقی سے ہماری موسیقی میں آئے ہیں وہ اپنے قدیم اصلی نغمہ کے مطابق

اس کا نفرنس کے کیا مقاصد ہونے چاہیے۔

میں یا ہندوستان کے گلوں میں آ کے بدل گئے ہیں ؟ اور بدلے ہیں،
تو کہاں تک ؟

قوال

فی الحال سمجھا جاتا ہے کہ قوال وہی معنی ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ
ہندوستان میں آئے مگر ہم جہاں تک غور کرتے ہیں سو اس کے
کہ قوالوں کے گانے کی وضع تھوڑی بدلی ہوئی ہے باقی اُن میں وہی
راگ رانگیاں اور دُھنین مروج ہیں جو ہندوستان کی موسیقی کی
ہیں۔ وہ اپنا کوئی جدا گانہ فن نہیں رکھتے۔ پتہ لگا چاہیے کہ اُس عربی موسیقی
اور قوالی میں اب کیا امتیاز ہے ؟ اگر قومیت اور مذہب کے اعتبار سے
دیکھا جائے تو قوالوں کے علاوہ بیان کی موسیقی کے تمام مستند استاد
اور کل زبردست گوئیے بھی مسلمان ہیں۔ موجودہ فن جس حالت میں
ہو اُس کے نشو و نما کا آغاز امیر خسرو کے زمانے سے ہوا جن کے ایجا
کے ہوئے راگ آج تک مروج ہیں۔ ترانہ بھی اُنھیں سے شروع ہوا۔
ستار اُنھیں نے ایجاد کیا۔ اور قوالی کی موجودہ شان تو حاصل اُنھیں
کی قائم کی ہوئی بتائی جاتی ہے۔ اس کے بعد گوالیار کے راجہ مان سنگھ
گجرات کے عمر سلطان بہادر۔ جو پور کے سلطان حسین شہر قی
کے خاص مربی رہے۔ اور آخر میں شہنشاہ اکبر محمد شاہ رنگیلے۔ اور
گھنٹو کے آصف الدولہ اور داجہ علی شاہ کے زمانوں میں اس کو
نمایاں ترقی ہوئی۔ موجودہ فن کی عملی طور پر جو شان نظر آ رہی ہے اُس
میں مذکورہ عربی موسیقی کی اکثر یادگارین موجود ہیں۔

موجودہ موسیقی
کے مرتبان سلف

مسلمانوں نے اس کو
اپنا فن کر لیا

گذشتہ صدیوں میں ہندوستان کی موسیقی کو مسلمانوں نے
اس کثرت سے اور ایسے شوق سے اختیار کیا کہ ہندو گوئیے شاہزادہ

باقی رہ گئے۔ فی الحال بڑے بڑے درباروں کے تمام مغنی مسلمان ہی ہیں اور کہا جاسکتا ہے کہ فی الحال یہ فن ہندوؤں کا نہیں بلکہ مسلمانوں کا ہے۔ کہا جاتا ہے اور سچ کہا جاتا ہے کہ محمد شاہ کے زمانے سے موسیقی میں تہذیب شروع ہوا۔ جبکہ مہمان سارنگ نے خیال ایجاد کیا۔ اور اس کے بعد لکھنؤ کی بد مذاقی نے پتہ اور ٹھہری کو رواج دے کے ملک میں ایک معتدل اور بازاری مذاق پیدا کر دیا۔ جس نے ہوری و دھرم کے متین و شائستہ علمی مذاق کو مٹا دیا۔ لیکن اُس سے زیادہ موجودہ پارسی تھئیٹر موسیقی کو تباہ کر رہے ہیں۔ جن کی طرف ملک کی گرویدگی اس قدر بڑھتی جاتی ہے کہ اگر اُن کی یہودہ میوزک خاص طور پر توجہ کر کے نہ سنبھالی گئی تو ہماری موسیقی کو ایسا سخت نقصان پہونچ جائے گا جس کا پھر کوئی علاج نہ ہو سکے گا۔

پارسی تھئیٹر کی
مضرت

فی الحال اپنی موسیقی کی ترقی کے لیے ہمیں جن تدابیر کو اختیار کرنا چاہیے وہ میرے خیال میں حسب ذیل ہونی چاہیے ہیں۔

تدابیر ترقی فن

(۱) تمام مستند گوتوں اور سنسکرت دان پنڈتوں سے مدد لے کے اس پتہ لگایا جائے کہ ریتنا کر اور اُس کے قریب الہمد مصنفوں کی موسیقی کیا اور کس شان کی تھی۔ فی الحال جو تقسیم راگوں راگینوں اور بھارجون وغیرہ کی بتائی جاتی ہے یہ کب سے شروع ہوئی؟ اور یہ قدیم موسیقی کے موافق ہے یا نہیں؟

(۲) عرب و عجم کی مذکورہ بالا موسیقی پر غور کر کے اور اُس کی تاریخ کے ماہرین سے دریافت کر کے معلوم کیا جائے کہ موجودہ موسیقی پر مسلمانوں کی موسیقی کا کس قدر اثر ہے۔ اُس کے اصول اور اُس کے راگ ہمارے

اصول اور راگون سے کہاں تک ملتے جلتے ہیں۔ اور آیا وہ موسیقی ہم قابل ہے کہ اُس کی مدد سے ہماری موسیقی کی ترقی میں مدد ملی جائے؟
 یاد و نون اصولاً اس قدر جُدا ہیں کہ اُس کی شرکت معسر ہے۔ اور اگر ایسا ثابت ہو تو اس وقت تک جو کچھ اثر اُس موسیقی کا پڑ چکا ہے اُس بھی دور کر دیا جائے۔

(۳) اس چھان بنان کے بعد شخص کر لیا جائے کہ ہمارے فن موسیقی میں کتنے رنگ۔ کتنی رنگینیاں۔ اور کتنی دھنین ہیں۔ اُن میں کون کون کس کس شان سے لگتے ہیں۔ اور عملی طور پر اُن کی مسئلہ شان و صورت کیا ہے؟

(۴) یورپ کے مغربی اثر سے جو ہماری معاشرت کے ساتھ ہمارے تمام فنون کو بھی گندہ کر رہا ہے۔ ہندوستان کی موسیقی کو بچایا جائے۔ جن حضرات کا یہ خیال ہو کہ یورپ کے سموزک سے ہندوستانی موسیقی کو کسی قسم کا فائدہ پہنچے گا وہ سخت غلطی میں مبتلا ہیں۔ اُدھر رخ کرنا اپنے قومی راگون کو سُدھا رنا نہیں بلکہ غارت کرنا ہو گا۔ اس لیے بڑے اہتمام سے کوشش کی جائے کہ ہماری موسیقی اپنی اصلی حالت پر برقرار رہے۔

(۵) جس قدر جلد ممکن ہو موسیقی کو تحریر میں لانے کے لیے نوٹیشن کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ جو ہمارا نہایت ہی ضروری اور سب سے زیادہ اہم فرض ہے۔

ان تمام تدبیروں کے اختیار کرنے کے لیے غالباً مندرجہ ذیل کارروائیاں مناسب ہوں گی۔

ان تدریسوں کے
عمل میں لانے کی
صور تین

(اول) صاحب راے موسیقی دانوں اور مستند مسلم الثبوت
گوٹون کی ایک کمیٹی قائم کر دی جائے جو پہلی تین تدریسوں کو اختیار کر کے
مفید و قابل و ثوق نتائج پیدا کرے۔ اُس میں ایسے ارکان رکھے جائیں
جو سنسکرت کی موسیقی میں پورا درخو رکھتے ہوں۔ اور تہذیبی ڈولپمنٹ
کی تاریخ سے آگاہ ہوں۔ دو چار رکن اُس کمیٹی کے ایسے بھی ہوں جو
ایرانی و عربی موسیقی کو جانتے ہوں۔ اور تبا سکیں کہ ہماری اور اُن کی
موسیقی میں کیا فرق ہے۔ اور ہندوستان کی موسیقی میں اُن کی کون کون
سی دھنین آگئی ہیں۔ اور اُن کا کون کون سا نغمہ ہمارے کس نغمہ سے ملتا ہوا ہے۔
(دوم) تھیٹر کیل کمپنوں کے طریقہ سے ایک اعلیٰ درجہ کا کانسرٹ
قائم کیا جائے اور اُس میں خواہ کسی ڈراما کی وضع میں خواہ پونہیں چاری
موسیقی کے تمام راگ اور راگنیاں اپنی اصلی روایات کے مطابق رنگ و وضع
لباس اور حالت میں دکھائی جایا کریں۔ اور اُن ایکٹروں اور ایکٹریوں
کی زبان سے اُن کا نغمہ صحیح حدود اور سُردوں سے ادا کرایا جائے۔ ایسے
ایک کانسرٹ کی ہندوستان کو بحد ضرورت ہے۔ اور اگر اس اصول پر کوئی
کمپنی اچھے سرمایے سے قائم کی گئی تو مجھے یقین ہے کہ اُسے بہت زیادہ
کامیابی ہوگی۔ یہ کانسرٹ دورہ کر کے سارے ہندوستان کا مذاقی
موسیقی درست کر دے گا۔ اور چند ہی روز کے اندر ہماری موسیقی تیز
ہو جائے گی۔

(سوم) لائق اور قابل لوگوں کی ایک مختص اور جداگانہ کمیٹی
نومینیشن یعنی خطا موسیقی کے ایجاد کے لیے منتخب کی جائے۔ جو یورپ کے نوٹس
اور دیگر اس میں جو خطا موسیقی ایجاد کیا گیا ہے اُس پر غور کر کے آسانی

سے ایک مناسب خط نغمہ ایجاد کر لے گی۔

میرے نزدیک اس میں زیادہ دشواری نہ ہوگی۔ میں نے اکتوبر ۱۹۱۳ء میں اپنے رسالہ دگلہ از میں ”موسیقی“ پر ایک مضمون لکھا تھا۔ جس کا وہ حصہ جو تحریر موسیقی سے تعلق رکھتا ہو اُس کا اس لکچر میں اعادہ کر دینا شاید نامناسب نہ ہوگا۔ لہذا وہ حسب ذیل ہے۔
 ”پوپ گری گوری کے مرنے کے بعد (جوش ۱۸۷۶ء کا واقعہ ہی)

خط موسیقی کی تاریخ

اس بات کی کوشش شروع ہوئی کہ موسیقی کی دھنوں کو کسی طرح سے قلمبند کیا جائے۔ مگر اُس زمانے میں جو خط موسیقی ایجاد کیا گیا اُس کا لکھنا چاہیے آسان ہو مگر گاتے وقت اُس کا لحاظ رکھنا اور اُس پر عمل کرنا بہت ہی دشوار تھا۔ اس لیے کہ ہمارے بیان جس طرح بعض لوگوں نے سُردن کے ناموں کے پہلے حرف یا ٹکڑے لکھ دیے ہیں وہاں بھی لکھ دیے جاتے تھے۔ مثلاً ”سرگم کی جگہ“ ”س“ یا ”سر“۔ ”کھب کی جگہ“ ”ر“ یا ”رکھ“۔ ”گندھار کی جگہ“ ”گ“ یا ”گن“۔ یہ تحریر کسی حد تک دھنوں کو محفوظ ضرور رکھ سکتی تھی مگر گانے والے گاتے وقت اُس سے مطلقاً فائدہ نہ اٹھا سکتے تھے۔ اور آواز کے دیگر خصائص تو مطلقاً نہیں معلوم ہو سکتے تھے۔
 ”دسویں صدی کے آخر میں اس تحریر کو من جمیع الوجوہ ناقص

دیکھ کے ایک نیا طریقہ ایجاد کیا گیا۔ اس میں سُردن کے شمار کے لحاظ سے سات متوازی خطوط قائم کیے جاتے۔ نغمہ کا خط اُن میں لہراتا ہوا چلتا اور گلا جس سُرب پر پہنچتا اُسی سُرب کی لکیر پر پہنچا دیا جاتا۔ اور اُس کے ساتھ گھے کے دیگر خصائص و حرکات نقطوں اور اڑے ترچھے اشاروں

سے بتا دیے جاتے۔

”اس خط نے موسیقی کی تحریر بہت آسان کر دی۔ لیکن
سنہ ۱۶۲۲ء میں جب پوپ بنی ڈکٹ ہشتم کا زمانہ تھا اس خط
موسیقی میں اور بہت سی ترقیاں اور اصلاحیں ہوئیں۔
چنانچہ اسی زمانے میں پادریوں کے بنی ڈکٹن گروہ کے
ایک راہب نے جو علاقہ ٹسکانی کے ایک گمنام گاؤں آرتو
میں پیدا ہوا تھا اور ”گوئی ڈر“ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا ساتوں
خطوط متوازی کا وہ شمار سات سے گھٹا کے چار ہی کر دیا۔
اس لیے کہ چار خطوط اور ان کے درمیان کی تین خلاؤں
سے مل کے سات مقامات قائم ہو سکتے تھے۔ اس میں چونکہ
خطوط کی درمیانی خلا سے بھی کام لیا گیا تھا اس لیے نقطوں
اور آرٹسے ترچھے خطوں کے علامات و نشانات ان خطوں
کے درمیان میں بھی قائم کر دیے جاتے۔

”یہی تحریر موسیقی آج تک یورپ میں مروج ہوئی اور
وہاں کے تمام موسیقی کا لہجہ میں اسی خط موسیقی کی تعلیم
دی جاتی ہے۔“

یورپ کے اس
خط کو ہم اپنا
بناسکتے ہیں

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہم اگر چاہیں تو اس تحریر سے
پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ لیکن نہیں۔ مناسب یہ ہو گا کہ ایک
کمپیوٹر اس پر غور کر کے اپنے موسیقی کے سُردوں مینڈوں اور زمزوں
اور ان کے نیچے اور اوپر کے مدارج کے لحاظ سے نئی علامتیں
قائم کر کے اس خیال سے فائدہ اٹھائے اور اسی تحریر کو اپنا بنالے۔

اب میں اپنے سامعین سے یہ غدار کر کے رخصت ہوتا ہوں
 کہ میں دراصل اُس عزت کا اہل نہ تھا جو اس کا نفرنس میں
 شریک کر کے مجھے دی گئی۔ میں موسیقی سے عملی طور پر پوچھیے تو
 بالکل ناواقف ہوں۔ مگر اہل فن کی صحبت اور مطالعہ کتب
 نے ایک حد تک اس فن سے آشنا کر دیا ہے۔ جس کی وجہ
 سے مجھے آپ ایسے بالکالوں کی خدمت میں اپنے ان خیالات
 کے ظاہر کرنے کی جرأت ہوئی۔ فقط

اورنگزیب

دل افزونہ !

۱۰ اولون کے شائق خصوصاً مولتنا شہر کے ناولون کے
شیدا اس رسالہ کو ضرور خرید فرمائیں گے۔ جس میں
ہمیشہ دو نئے ناولون کا سلسلہ جاری رہتا ہے
مجموعی صفحات ۱۸۸ کے علاوہ ۳۲۲ ہوتے ہیں۔ اور
ہر ناول کا ایک جز رہتا ہے۔ ایک ناول مولتنا کا طبع
ہوتا ہے اور دوسرا گریزی کے کسی ناول کا ترجمہ
سالانہ چندہ مع محصول ڈاک دور و پیشہ
ہر سال کا پہلا نمبر عری کا وی پی بھیج کے
چندہ وصول کر لیا جاتا ہے۔ نمونے کے لیے ۳
مینجر و گلدار و دل افروز

مہذب پاک ایجنسی

نہایت دلچسپ و قابل دیدن ناول

عظمت کور ایتولہ العبرہ، عا، ع
 ۱۰ فتنہ ۱۰ عا، ع
 ۱۱ بیلہ ۱۰ عا، ع
 ۱۲ مولسری ۱۰ عا، ع
 ۱۳ جوہی ۱۰ عا، ع
 ۱۴ روح خس ۱۰ عا، ع

کھانے کا کتنا کو

المستبرع حكيم محمد سراج الحق كره زبن بيگان كهفؤ

تالیق بی بی - اس شارح صاحب اور باذوق کتاب کا دوسرا ایڈیشن تیار ہو گیا۔ دینا میں ناہنجاری تو اسے ضرور پڑھے۔ اور موی کے مزاج شناس ہو جائے قیمت فی جلد ۸

تصانیف مولانا محمد عبدالحکیم صاحب شتر

تاریخ

- (۱) جنید بغدادی - حضرت جنید کے حالات - عد
- (۲) ابو بکر شبلی - حضرت شبلی کے حالات - عد
- (۳) تاریخ سندھ - عرب کے فتوحات سندھ کی محققانہ تاریخ - جلد اول عد جلد دوم - عد
- (۴) عصر قدیم - اقوام سلف کی نہایت واضح تاریخ (لائبریری ایڈیشن نمبر ۴) عد
- (۵) حروب صلیبیہ - انگریزی ترجمہ اور عربی سے تھی - عد
- (۶) افسانہ قیس - مجنون عاری کے حالات - عد
- (لائبریری ایڈیشن نمبر ۱)
- (۷) حسن بن صباح - باطنیہ اسماعیلیہ گانی اور یسوی کے خوجوں کی اصلیت (لائبریری ایڈیشن نمبر ۲) عد
- (۸) سیکنہ بنت حسین - جناب سیکنہ کے حالات زندگی عد
- (۹) خواجہ معین الدین چشتی - عد
- (۱۰) ملکہ نومیہ - سلف کی ایک عربی تراویک - عد
- (۱۱) آغا علی صاحب - رئیس مرحوم کے حالات عد

ناول

- (۱۲) فلور افلور نمبر ۱ - اندلس میں سلطنت عرب (لائبریری ایڈیشن نمبر ۶) عد
- (۱۳) فلانا - عہد صحابہ کا ایک سچا واقعہ (لائبریری ایڈیشن نمبر ۷) عد
- (۱۴) رومۃ الکبری - روم پر گلوگوں کا حملہ - عد
- (۱۵) زوال بغداد - دولت عباسیہ کا استیصال عد
- (۱۶) مالک - غوریوں کا عروج - عد
- (۱۷) یوسف نجم کمال - جنگ بین بنین آپہنٹی - عد
- (۱۸) فتح اندلس - اسپین پر عربوں کا حملہ - عد

- (۱۹) فردوس برین - جینے جی جنت کی سیر - عد
- (۲۰) غیب ان دو وطن - حیرت انگیز غیبیاتی - عد
- (۲۱) حسن کا ڈاکو - حرام پور کے نواب کی سرگزشت - عد
- حصہ اول ۱۲ حصہ دوم - عد
- (۲۲) اسرار در بار حرام پور - حرام پور کے نواب کے اور حالات نمبر ۱ ۵ نمبر ۲ ۵ عد
- (۲۳) خوفناک محبت - ہندوستانی شریف زادوں کی پاکداسنی و جہالت کی اس اچھی تصویر بنی ہوئی ہے عد
- (۲۴) الفانسو - جریٹا سلی (مصلیہ) کے قدیم حالات کا ایتنا ریختی واقعہ عشق نہایت سچے اور مؤثر جذبہ - عد

متفرق

- (۲۵) الحکم الرفاعیہ معرفت میں سیاحہ رفاعی کے ایک پر مغز سالہ کا ترجمہ - عد
- (۲۶) سر سید کی دینی کی برکتیں - عد
- دگداز کی جلدیں

(۲۷) جلد ۱۹۱۳ عد	(۲۸) جلد ۱۹۱۴ عد	(۲۹) جلد ۱۹۱۵ عد
(۳۰) جلد ۱۹۱۶ عد	(۳۱) جلد ۱۹۱۷ عد	(۳۲) جلد ۱۹۱۸ عد
(۳۳) جلد ۱۹۱۹ عد	(۳۴) جلد ۱۹۲۰ عد	(۳۵) جلد ۱۹۲۱ عد
(۳۶) جلد ۱۹۲۲ عد	(۳۷) جلد ۱۹۲۳ عد	(۳۸) جلد ۱۹۲۴ عد
(۳۹) جلد ۱۹۲۵ عد	(۴۰) جلد ۱۹۲۶ عد	(۴۱) جلد ۱۹۲۷ عد
(۴۲) جلد ۱۹۲۸ عد	(۴۳) جلد ۱۹۲۹ عد	(۴۴) جلد ۱۹۳۰ عد

متفرق مطبوعات دگداز پریس

معاشرت - انگریزی کی گلستان سر جان یکسا کی شہور کتاب "بوز آف لائف" کا ترجمہ عد
پاداش عمل - ایک نہایت ہی دلچسپ ناول موسوم "گتھ" کا ترجمہ موسوی محمد صدیق حسن صاحب نے نہایت ہی خوبی و فصاحت سے ترجمہ کیا اور شائع کیا کے دل افروز میں شائع ہوا - عد

المشتر حکیم محمد سراج الحق منیجر دگداز کٹرہ بزن بیگان - لکھنؤ

آئینہ سلوک

مصنفہ

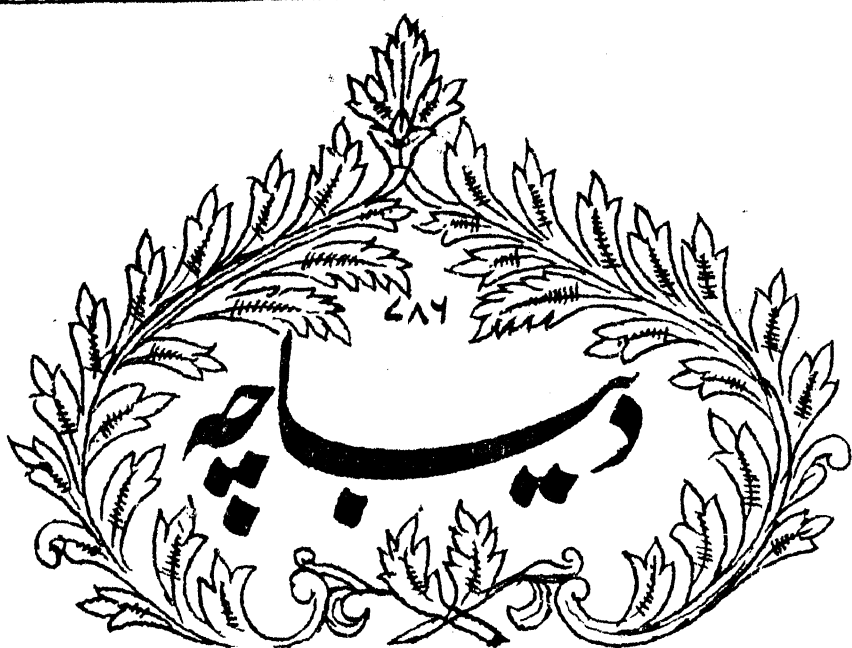
خادم کونین محب حسین عارف اللہ و نوبہ مصنفہ
گلزار معرفت - رقصات محب - وصال حق وغیرہ

خلاصہ

اس کتاب میں معرفت و حقیقت کا دریا کوزے میں بھرا گیا ہے اور تمام
اسرار باطن پر ایک اجالی نظر ڈالی گئی ہے۔ لاک کو اس کتاب کی
اشد ضرورت تھی اور یہ اردو فلسفہ تصوف میں آپ
اپنی نظیر ہے۔ کوئی مقام ترقی اور منزل اس میں
فرو گذاشت نہیں کیا گیا ہے۔

۱۳۳۲ھ
مطبع اخیر و کن واقع فضل گنج حیدر دکن بزن چھا

جمہل حقوق محفوظ



یہ کتاب اس غرض سے لکھی گئی ہے کہ عوام الناس کو علم تصوف اور فلسفہ باطن سے اجالی واقفیت حاصل ہو اور وہ ان غلط خیالات سے محفوظ رہیں جو اس زمانہ میں روحانیات کی نسبت بہتر شایع ہیں اگر اس کے پڑھنے سے صرف یہی مقصد حاصل ہوا تو مصنف کی محنت چیز ہوئی۔ مگر اس کتاب کا مقصد کتاب میتھڈ ٹو سائیک ڈولپ سینٹ یعنی انکشاف سرِ عالم مثال ہے۔ مصنف کے قرآن شریف اور حدیث نبوی اور دیگر کتب تصوف بھی مدلی ہے اور اپنے ذاتی تجربہ و مشاہدہ سے بھی کام لیا ہے اور جدید اور قدیم معلومات جو بات ٹھیک نظر آئی ہے وہی درج کی گئی ہے گویا کہ یہ ایک عطر ہے جو ہزاروں مختلف رنگ اور خوشبو دار پھولوں سے کھینچا گیا ہے۔ چنانچہ ہر کتاب کے سرِ بیج الفہم بنانے میں سعی کی گئی ہے اور مطالب کی صحت کا خیال بھی رکھا گیا ہو امید قوی ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے والوں کو ضرور اسرار باطنی کے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ تو کلمتہ علی اللہ وَهُوَ حَسْبُنَا وَنِعْمَ الْوَكِيلُ۔ مراقم۔ محب حسین۔ فیانیہ حیدر آباد لکھنؤ

فہرست مضامین اکیٹھ سلوک

نمبر	مضمون	صفحہ	نمبر	مضمون	صفحہ
۱	فصل ۱۔ اندراج الکل فی الکل عالم مثال کہان ہے۔	۱	۱۳	حفاظت کرنیوالا پردہ	۳۶
۲	غیر مری دنیا	۲		فصل ۳ علم اشراق یا دوسروں کے ساتھ باطنی مراسلت۔	
۳	عالم آخرت اور عالم مثال کی ثبات	۳	۱۴	زندوں کے ساتھ باطنی تار برقی	
۴	پر بکثرت شہادتیں موجود ہیں۔	۸	۱۵	یعنی روشن ضمیری۔	۳۹
۵	عالم مثال کے نامحسوس اثرات	۱۱	۱۶	انتقال خیالات و احساس سے	
۶	یا آخرت کا وجود حقیقی	۱۲	۱۷	بچنے کی معقول تدبیر	۴۲
۷	سونا اور خواب دیکھنا	۱۶	۱۸	مردوں کے ساتھ باطنی مراسلت	۴۳
۸	فصل ۲ ہم عالم مثال کو اپنی آنکھوں سے کیوں نہیں دیکھتے۔		۱۹	باہمی گفتگو۔	
۹	ہمارے اور عالم مثال کے درمیان	۱۸	۲۰	الہام و ارادات اور الفا	۴۵
۱۰	پردہ یا حجاب	۲۰	۲۱	خود بخود لکھا جانا اور تصویر کھینچنا	۴۸
۱۱	خوفناک مضامین اور کتابیں	۲۲	۲۲	سارے والے کی باتیں	۴۹
۱۲	عقل سلیم اور عام فہمی کو کام لینا چاہیے	۲۸	۲۳	روح کا مادی شکل اختیار کرنا	۵۱
۱۳	من عرف نفسه فقد عرف ربه	۲۹	۲۴	خود بخود سلیٹ پر لکھ جانا	۵۴
۱۴	قبل از وقت عالم مثال کا کھلنا	۳۱	۲۵	سلاکت کا طریقہ	
۱۵	عالم مثال کے اثرات	۳۳	۲۶	فصل ۴۔ معمول	
			۲۷	جسمانی خصوصیت	

نمبر	مضمون	صفحہ	نمبر	مضمون	صفحہ
۲۴	ٹیلیگراف یا عالم مثال کی تاریخ		۷۹	یا اضطراری ہوتے ہیں۔	
	اور پیغام۔	۵۷	۸۲	روح اعلیٰ	۳۶
۲۵	مقدس کنواری لڑکیاں	۵۹	۸۳	عالم مثال کے تجربوں کی یاد	۳۷
۲۶	معمول کو خطرات	۶۱	۸۵	آئینہ واقعات کا مشاہدہ	۳۸
۲۷	نایاک اطراف و جوانب	۶۳		عالم آخرت سے تعلق پیدا کرنا یا	۳۹
۲۸	مجالس اہل شد کی شرائط	۶۶	۸۶	عالم ملکوت اور جبروت کا کھلنا۔	
۲۹	روح کو مادی شکل میں لانے کے خطرات	۶۸		فصل ۶۔ عالم مثال کے دیکھنے کی ادنیٰ ابتدائی قوت	
۳۰	ایٹھریل مادے کا نقصان	۶۹		عالم مثال کے دیکھنے کی ادنیٰ ابتدائی قوت	۴۰
۳۱	زندہ اشخاص پر ارواح کا مسلط ہونا یا قبضہ کرنا	۷۰	۸۷	ابتدائی قوت قدیم قوم اہل بیت	
	فصل ۵۔ روح اعلیٰ		۸۹	انسانی جسم میں عالم مثالی کو مرکز	۴۱
۳۲	تفہیم دماغ		۹۱	قوت اسے عقل کی ترقی	۴۲
۳۳	اصطلاحی الفاظ کا غلط استعمال اور اسوجہ سے کتاب کو سمجھنے میں غلط فہمیاں		۹۳	درمیانی حالت	۴۳
	روح کے افعال و خواص		۹۵	اور دوسرے چکر اور مرکز	۴۴
۳۴	روح طبعی جو افعال غیر ارادی		۹۷	دوسری آنکھ یعنی چشم باطنی	۴۵
			۹۹	چشم باطنی پیدا کرنے کے آلات	۴۶
			۱۰۲	قدیم زمانہ کی احتیاط	۴۷
				بعض نقصانات یا مضر ترین	۴۸

نمبر	مضمون	صفحہ	نمبر	مضمون	صفحہ
	فصل ۷ چند باطنی پیدا کرنے کے ابتدائی طریقے۔			روحانیت کے کوئی کمالات ہر نہیں ہو سکتے۔	۱۲۵
۴۹	تقطیل عواس ظاہری اور باطنی	۱۰۶	۵۹	اصول تکرار	۱۲۹
۵۰	حبس دم یا سانس روکنا	۱۰۷	۶۰	ابتدائی مراتب یعنی طہارت جسم	۱۳۱
۵۱	حبس دم کا اصلی مقصد	۱۰۸	۶۱	روزمرہ کی زندگی میں دل کا تربیت کرنا	۱۳۶
۵۲	حبس دم کے نتائج	۱۱۰		توجہ یا ہمت یعنی خیال کو ایک ہی مرکز پر قائم کرنا۔	۱۴۲
۵۳	خیال کو شمسی مرکز یا چکر برجمنا	۱۱۲	۶۲	مراقبہ	۱۴۵
۵۴	ایک سفید یا سیاہ دل پر کبھی مبتلا		۶۳	تصور شینخ	
	لوٹو یا آئینہ پر نظر کرنا	۱۱۴	۶۴	عالم مثال کا کھلنا	۱۵۱
۵۵	اشغال بے فائدہ	۱۱۶	۶۵	عالم مثال کے کھولنے کا	
	فصل ۸ - عالم مثال کے اعلیٰ طبقات کی دید		۶۶	ایک خاص طریقہ	۱۵۲
۵۶	سچے سالکین کا طریقہ	۱۱۹		فصل ۹ - فنا فی اللہ اور بقا باللہ۔	
۵۷	مدارج ترقی کو جلدی حاصل کرنا	۱۲۲			
۵۸	القلب خلاق الاشیا یعنی دل بہت بڑا بنایا والا شکل کو نکالتا ہے	۱۲۵			
۵۹	روح کا طہو بہم کی ترقی پر مختصر مضمون				
	جسم کی ترقی اور انوکے بغیر قوائی				

بسم اقدس الرحمن الرحیم

آئینہ سلوک

عالم مثال

فصل اول۔ اندراج الكل في الكل

عالم مثال کہاں ہے؟

دنیا کے تمام مذاہب اس بات پر متفق ہیں کہ یہ دنیا یا عالم ناسوت
دوسری وسیع دنیا یا عالم مثال کا ایک پیش دالان ہے۔ یعنی مرنے
کے بعد ہمیں ایک اور عالم میں جانا ہوتا ہے جو اس عالم مادی سے
بہت ہی بڑا اور وسیع ہے۔ جسکو عالم مثال یا عالم ملکوت کہتے ہیں
مادین اور آجکل کے سائنٹفک لوگ تو اس عالم کے وجود ہی
سے منکر ہیں۔ اور اہل مذہب یعنی علمائے ظواہر اس کے وجود
کو انکار نہیں کرتے۔ مگر اسکو محفی اور نامعلوم قرار دیتے ہیں۔ اور

انہوں نے دنیا داروں کو یہ باور کرایا ہے کہ عالم آخرت آسمان
 پر ہے۔ مشکلیں نے اسکے اثبات میں مختلف دلائل پیش کئے
 ہیں اور شاعروں نے اسکے باغون اور جنتوں اور جہنموں کے
 مختلف خواب دیکھے ہیں اور اپنے خیالوں کو طرح طرح کی
 رنگا میزیوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مگر اہل دل اور اہل تصوف
 نے اس عالم مثال کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اسکو صاف
 صاف اسی طرح بیان کیا ہے جیسے کوئی سیاح کسی ملک کو جا کر
 دیکھے اور پھر اس کے حالات نہایت ہی مشرق و بسط کے ساتھ
 لکھے مہاتما بودہ فرماتے ہیں کہ میں عالم مثال سے اسی طرح واقف
 ہوں جس طرح اپنے وطن کے گلی کو بچوں سے سالکین کو عالم مثال
 کے تمام طبقات کا تفصیلی علم ہے اور انہوں نے اس عالم کے
 باشندوں اور انکے اچھے بُرے حالات کو نہایت ہی احتیاط
 کے ساتھ بیان کیا ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں اسی عالم کی
 نسبت جا بجا مختلف پیرائے میں بیان کیا گیا ہے کہ وہاں حورین
 ہیں اور محل سراہین اور دنیا کی طرح صد ہا قسم کے میوے ہیں۔
 وہاں نہرین جاری ہیں اور طرح طرح کے خوشنما باغات ہیں۔
 وہاں لوگ بڑے عیش و آرام میں رہیں گے۔ اور وہاں عذاب
 کی بھی مختلف شکنیں ہیں۔ جو لوگ جنت اور بہشت کے مفضل
 حالات معلوم کرنا چاہتے ہیں انہیں ضرور ہے کہ قرآن مجید کو بغور

ملاحظہ فرمائیں اور احادیث اور اقوال بزرگان دین سے بھی جنہوں نے بذاتہ اس عالم کا مشاہدہ کیا ہے عالم مثال کے پورے حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔

آج کل روز بروز اس عالم مثال کا علم زیادہ ہوتا جا رہا ہے اور اسکے تفصیلی کیفیات ساکین پر زیادہ وضاحت کے ساتھ منکشف ہوتی جاتی ہیں مگر ابھی عوام الناس کو ان حالات کی کچھ خبر نہیں اور وہ بوجہ عدم علم کے ان باتوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے اور اپنی ہمالت کی وجہ سے خداوند تعالیٰ کی وسیع مخلوقات کے مشاہدے سے محروم ہیں۔

جب کسی معمولی دنیا دار سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ عالم مثال یا عالم آخرت کہاں ہے۔ تو وہ اس سوال کو سنکر دنگ رہ جاتا ہے۔ اور کوئی جواب بن نہیں پڑتا مگر جب اسکی یہ ہیرت اور تعجب کم ہوتے ہیں تو اسکو یاد آتا ہے کہ میں نے کہیں کسی مذہبی کتاب میں آخرت کا لفظ پڑھا ہے یا کسی واعظ کی زبان سے عالم مثال یا آخرت کا بیان سنا ہے تو وہ اپنی اذگلی آسمان کی طرف اٹھا کر کہتا ہے کہ عالم آخرت وہاں ہے۔ اس کے اس جواب سے صاف واضح ہے کہ وہ اپنے ذہن میں عالم آخرت کی جگہ آسمان میں اسی طرح جانتا ہے جس طرح کہ زہرہ اور مشتری ہیں۔ خصل اگر یہ شخص کتب تصوف کا مطالعہ کرتا تو اسکو معلوم ہو جاتا کہ عالم

ہمارے ہی اندر اور باہر ہر جگہ ہے اور ہم اسکے اندر ہیں اور وہ ہمارے دل کے اندر ہے۔ اور اسی طرح ہر چیز کے اندر اور باہر عالم مثال موجود ہے۔ گویا کہ دنیا کے اندر عالم مثال اور عالم مثال کے اندر دنیا ہے۔

بالفرض اگر ہم اس کا یہ جواب صحیح مان لیں کہ عالم مثال آسمان میں ہے اور ہم مشتری تارے پر جا بین اور وہاں بھی یہی سوال کریں کہ عالم مثال کہاں ہے۔ تو اس وقت بھی یہ معمولی آدمی یہی جواب دے گا کہ ہمارے اوپر ہے اور اس وقت یہی ہماری زمین ہمارے اوپر نظر آئے گی۔ جس طرح کہ اس وقت ہمارے مشتری ہمارے اوپر نظر آتی ہے ہمیں کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ ہم عالم مثال اپنے اوپر خیال کریں جبکہ وہ ہمارے ہی اندر ہے اور یہ کہیں کہ وہ آسمان میں ہے۔

غیر مری دنیا

ساکین جو مخفی اسرار قوانین قدرت سے آگاہ ہیں اس غیر مری دنیا یعنی عالم مثال سے بخوبی واقف ہیں۔ ہمارے اس کرہ ارض کے اطراف ایک اور لطیف مادے کا عالم محیط ہے اور یہ لطیف مادہ دنیا کی ہر شے کے اندر سرعت کئے ہوئے ہے۔ کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ وہ ایک چھوٹے سے چھوٹے ذرہ ہی کیون نہ ہو جس کے

اندر اور باہر یہ لطیف مادہ موجود نہ ہو۔ ہم سب اس وقت عالم مثال میں موجود ہیں مگر اُس سے واقف نہیں۔ عالم مثال کے مخلوقات انسان۔ جانور وغیرہ سب ہمارے اطراف و جوارب پائے جاتے ہیں۔ مگر ہم انہیں دیکھتے نہیں۔ آسمان پر عالم آخرت کو تلاش کرنا بالکل بے سود ہے۔ نہ وہ ستاروں میں ہے اور نہ وہ اور کہیں مگر وہ ہمارے ہی اطراف اور ہمیں میں موجود ہے جس طرح کرہ ہوا اور آیتھس ہمارے اطراف و جوارب محیط ہیں جنہیں ہم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتے اسی طرح عالم مثال بھی ہمارے چاروں طرف محیط ہے۔ اس عالم کے باشندے ہمارے پاس سے بلکہ ہمارے اندر سے گزر جاتے ہیں مگر ہمیں اُن کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔

قرآن شریف میں جہان کہیں سموات کا ذکر ہے تو اس سے یہی سات عالم مراد ہیں اور آسمان سمو سے مشتق ہے جسکے معنی بلندی کے ہیں۔ پستی اور بلندی کے معنی ثقل اور لطافت کے ہیں اور سبعہ سموات سے مراد سبعہ عوالم ہیں جن کے مادے ایک دوسرے کی نسبت لطیف تر ہیں۔

جب اس وسیع عالم کے لوگ اس مادی دنیا میں کام کرنا اور اس کا تجربہ اور مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں تو وہ اس جسم کثیف کو اختیار کرتے ہیں۔ اسی کارروائی یعنی اس جسمانی قالب میں آنے کو ہم حیات یا پیدائش یا زندگی وغیرہ کہتے ہیں۔ اور جب یہ لوگ اس دنیا کی سیر

اور غماشے یا محنت اور کام سے دل برداشتہ ہو جاتے ہیں تو اس
 غالب جسمانی کو چھوڑ دیتے ہیں اور اس وقت یہ کارروائی یعنی جسم
 کے چھوڑ دینے کو موت کہتے ہیں اسکی ٹھیک مثال یہ ہے کہ آدمی
 جب گھر سے باہر جاتا ہے۔ تو اپنے بدن کی حفاظت کے لئے کوٹ
 پہن لیتا ہے اور جب مکان میں واپس آتا ہے۔ تو اُتار ڈالتا ہو
 یا جب کپڑے پرانے ہو جاتے ہیں تو انہیں پھینک دیتا ہے اور
 نیا جوڑا پہنتا ہے۔ غرض کہ حیات اور موت صرف اس مادی قالب کا
 اختیار کرنا اور چھوڑ دینا ہے۔ اور یہ عالم آخرت جبکا مادہ لطیف
 ہے ہمارا اصلی وطن ہے اور یہ کثیف مادے والی دنیا پردیس یا
 اجنبی ملک ہے جہاں ہم کچھ مدت تک رہ کر چلے جلتے ہیں۔ ہم
 اس دنیا میں دقتاً فوقتاً آتے ہیں اور یہاں تھوڑے یا بہت وقت
 تک ٹھہر کر واپس چلے جاتے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک
 شخص تمام اشیاء کے خریدنے کے لئے دور دراز ملک کو جاتا ہے۔
 پھر وہاں سے انہیں لاکر عمدہ مصنوعات تیار کرتا ہے۔ اسی طرح
 ہم اس دنیا میں علم الہی اور دنیا کا تجزیہ اور مشاہدہ حاصل کرنے کے
 لئے آتے ہیں اور پھر اپنی طاقت کے بموجب یہاں کام کر کے لوٹ
 جاتے ہیں۔ اسی آرزو جانی کو حیات اور موت سے تعبیر کرتے ہیں۔
 عالم آخرت سے دنیا میں آنے جلنے کو اہل ہند اپنی اصطلاح میں
 آواگون (تناسخ) کہتے ہیں اور اہل اسلام اسکو بعث و نشر سے تعبیر

کرتے ہیں اور اہل یورپ اسکو اپنی زبان میں ربی انکارتیشن
 بولتے ہیں۔ الفاظ میں اختلاف ہے مگر معنی اور مفہوم ان سب
 کے ایک ہی ہیں چنانچہ قرآن شریف میں خداوند تعالیٰ جل شانہ
 فرماتا ہے۔ وَكُنْتُمْ أَشْرًا فَاحْيَاكُمْ ثُمَّ يَعْمِدُكُمْ تَوْبَةً
 يَحْيِيكُمْ تَرَىٰ لَهُ تَرْجَعُونَ۔

یعنی تم مردے تھے پھر تم کو جلایا۔ پھر تم کو مارا پھر تم کو جلایا پھر
 تم اسی کی طرف لوٹتے ہو۔

اس آیت سے صاف واضح ہے کہ دنیا بین لوگ مر کر پھر زندہ ہوتے
 ہیں اور پھر زندہ ہو کر مرتے ہیں یعنی عالم آخرت سے آتے اور پھر
 دہین لوٹ جانے کا سلسلہ قائم ہے اسی طرح ایک اور آیت قرآن
 سے بھی آواگون ثابت ہے اور وہ یہ ہے کہ بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ
 مِنْ خَلْقِ جَدِيدٍ۔ یعنی وہ بار بار زندگی کا جامہ پہنتے ہیں یعنی
 اس عالم ناسوت میں پیدا ہوتے ہیں۔ الغرض آیات قرآنی سے ہمارا
 یہاں آنا جانا بخوبی ثابت ہے اور عالم آخرت یا مثال ہمارا وطن مالوت ہے
 مگر عموماً لوگ اس عالم آخرت سے واقف نہیں۔ جو اس دنیا کے

دنی سے بہت ہی وسیع ہے۔ اس عدم علم کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے
 بعض باطنی حواس سے کام نہیں لے سکتے۔ اگرچہ کہ وہ ہم میں بالفضل
 بطور قابلیت کے موجود ہیں۔ مگر کسی شخص کی قوت شامہ سردی یا
 اور کسی وجہ سے جاتی رہی ہو اور وہ ایک ایسے کمرے میں داخل

ہو جہاں گلاب کے خوشبودار پھول رکھے ہوں اور ان سے بھینی
 بھینی خوشبو چاروں طرف پھیل رہی ہو تو وہ کبھی ان پھولوں کی
 بو کو محسوس نہ کرے گا۔ یا اگر کوئی ایسا شخص جسکی نظر کوتاہ ہے کسی
 ایسے سبزہ زار یا گلستان میں جائے جہاں رنگ برنگ کے پھول
 کھلے ہوں اور چاروں طرف سبزہ لہلہا رہا ہو تو اس کم نظر کو یہ قدرت کی
 خوبصورتی پوری طور سے دکھائی نہ دے گی بلکہ اسکو بھورا دھواں سا
 نظر آئے گا۔

عالم آخرت فی الواقع موجود ہے۔ مگر اسکو خوبصورت قدرتی مناظر
 اور اسکے باشندے ہمیں دکھائی نہیں دیتے۔ ہم میں اس کے محسوس
 کرنے کے حواس باطنی موجود تو ہیں مگر وہ اس قدر کمزور اور
 بے کار ہیں کہ اس عالم کی ہوا کا متوج یا حرکات ان تک نہیں پہنچتے
 اور ہم بوجہ عدم قابلیت کے وہاں کی کسی چیز کا ادراک نہیں کر سکتے
 ابھی عام طور پر اس قدر ترقی باطنی ظہور میں نہیں آئی کہ اکثر لوگ اس
 عالم کو اپنے حواس باطنی سے مشاہدہ کریں۔ مگر امید ہے وہ زمانہ
 نزدیک ہے کہ عام طور پر لوگ اس عالم کو اپنی نظر سے دیکھیں گے
 اور اس کی مخلوق سے فائدے اٹھائیں گے۔

عالم آخرت اور عالم مثال کی اثبات پر بکثرت
 شہادتیں موجود ہیں

اگر ہم اخبارات اور کتابوں کو اس نظر سے پڑھیں کہ لوگوں کو وقتاً
 فوقتاً کون سے ایسے واقعات کا تجربہ ہوا ہے یا ہو رہا ہے جو عالم
 آخرت یا عالم مثال کی شہادت میں پیش کئے جاسکتے ہیں۔ تو تھوڑو
 ہی عرصہ کے بعد ہمارے پاس ایسے واقعات کا خزانہ جمع ہو جائیگا
 جس سے ہمیں ان عالموں کے یقین میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے گا
 ہر شخص کا انفرادی تجربہ اور مشاہدہ تو نا کافی الثبوت ہے۔ مگر
 جب اکثر اشخاص کا یہ انفرادی تجربہ ایک جگہ جمع کیا جاتا ہے تو وہ
 البتہ کسی مسئلہ کے اثبات کا پورا ثبوت ہوتا ہے اور اسی کو اصطلاح
 منطق میں تو اتر کہتے ہیں۔ جو یقینی استدلال کی ایک قسم ہے۔ اتفاقاً
 جب کبھی ہم ایک خواب دیکھتے ہیں یا کسی روح کو اپنے سامنے پاؤ
 ہیں تو یہ واقعہ ایک وقت تک ہمیں یاد رہتا ہے اور اس کو ہم اپنے
 دو چار دوستوں سے بیان کرتے ہیں اور اس پر تھوڑا بہت غور
 کر کے کوئی نتیجہ نکالتے ہیں مگر پھر ایک عرصہ کے بعد ہم اس واقعہ
 کو بھول جاتے ہیں۔ اور وہ نسیا منیا ہو جاتا ہے۔

واقعی اس جزوی تجربہ اور مشاہدے سے کوئی کافی نتیجہ تو نہیں
 نکلتا یا کسی امر خاص کا ثبوت تو نہیں ہوتا مگر جب ہم اُن سوسائٹیوں
 کے رجسٹرون اور رپورٹوں کو بغور مطالعہ کرتے ہیں جو عالم مثال کی
 تفتیش اور تحقیقات میں مصروف ہیں تو ہمیں یہ بات معلوم ہوتی
 ہے کہ انسان بحیثیت مجموعی اس وسیع اور مرکب عالم سے متصل ہے

جسکو ہم مثال کہتے ہیں اور جسے ہم مشاہدہ بھی کرتے ہیں۔
 کبھی کبھی لوگوں کو سچے خواب نظر آتے ہیں۔ اور وہ دور و دراز
 اشخاص اور مقاموں کو اپنے سامنے دیکھتے ہیں اور ان کی نسبت
 صحیح خبریں دیتے ہیں۔ بعض اشخاص خواب یا مراقبہ میں دیکھ کر آئندہ
 کے حالات کی نسبت سچی پیشین گوئیاں کرتے ہیں اور آنے والے
 خطرات اور مصائب کو کنایہ اور اشارتاً بیان کرتے ہیں۔ بعض اشخاص
 کو مرے ہوئے آدمی ان مقامات میں نظر آ جاتے ہیں جہاں وہ
 اپنی زندگی میں اکثر سکونت رکھتے تھے۔ بعض لوگ بہو توں اور
 ارواحِ خبیثہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ڈر جاتے ہیں۔ بعض اشخاص
 کے دماغوں میں ایسے نئے نئے اجنبی اور غیر معمولی خیالات
 آتے ہیں جن کی وجہ سے وہ نہایت ہی مشہور و معروف آدمی ہو جاتے
 ہیں اور لوگ انہیں ولی اور دیوتا کہنے لگتے ہیں۔ ان تمام واقعات
 سے بخوبی ثابت ہے کہ انسان ایک بہت ہی صاحبِ عظمت اور
 جامع جمیع کائنات وجود ہے حالانکہ بظاہر وہ ایک معمولی مخلوق نظر
 آتا ہے۔ اور یہ دنیا ایک اور وسیع عالم کے اندر غرق ہے اور یہ
 خاک کی گولہ دوسرے عظیم الشان اور لطیف گولہ کے اندر موجود ہے
 اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ انسان صرف سلوک ہی کے
 ذریعہ سے عالمِ آخرت یا عالمِ مثال کو پہچانے بلکہ اس کے اطراف
 و جوانب اس قدر مادی اور غیر مادی شہادتیں موجود ہیں جن کے

ملاحظہ سے ان عالموں کا پورا یقین اسکو ہو سکتا ہے۔

مشابہ سے اور تجربہ کے علاوہ تمام کتب ربانی مثلاً قرآن شریف
توریت۔ انجیل۔ گیتا وغیرہ اور اقوال صوفیائے کرام اور تذکرات
اہل اقدس کے سب اس بات پر بالاتفاق شاہد ہیں کہ عالم آخرت
یا عالم مثال موجود ہے اور اسکے وجود میں کوئی شک و شبہ نہیں
ہو سکتا۔ چنانچہ قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے **وَبِالْآخِرَةِ**
هُمْ يُوقِنُونَ۔ یعنی جو لوگ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ایمان
بالآخرت جزو اسلام ہے۔ جس سے کوئی شخص انکار ہی نہیں کر سکتا۔

عالم مثال کے نامحسوس اثرات

عمر بھر ہم پر عالم مثال کے اثر پڑتے رہتے ہیں۔ مگر ہم انہیں
بہت مشکل سے محسوس کرتے ہیں۔ ہر لحظہ دوسرے استخاص
کے احساس اور خیالات کا اثر ہمارے دلون پر پڑتا ہے اور یہ حس
اور خیالات ہمیں اپنی طرف کھینچتے ہیں اور ہمارے دماغون میں چکر
کھاتے ہیں۔ اور بالآخر وہ ہم سے افعال کی صورت میں سرزد ہو
جائے۔ مگر ہکو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ہمارے خیالات نہیں ہیں۔ ہم
انہیں اپنے ہی ذاتی خیالات تصور کرتے ہیں۔

اس مقام پر ہم ایک واقعہ کو پیش کرتے ہیں جو ایک صاحب
کو جہاز کے سفر میں پیش آیا تھا۔ اس واقعہ سے اس امر کا پورا ثبوت

ہوتا ہے کہ ایک شخص کے احساس اور خیالات کا اثر دوسرے شخص پر پڑتا ہے۔

وہ بیان کرتے ہیں کہ میں جہاز پر سوار تھا۔ اور اپنے کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھا کہ اتنے میں میرے دل میں دفعتاً وحشتناک احساس اور خیالات پیدا ہوئے۔ میں نے غور کیا تو کوئی وجہ ان خیالات کے پیدا ہونے کی معلوم نہیں ہوئی۔ کتاب کے مضامین میں کوئی اس قسم کی بات نہ تھی جن سے یہ گھبراہٹ کے احساس پیدا ہوتے۔ پھر میں نے اپنے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو معلوم ہوا کہ ایک ماں گھبرا کر اپنے بچے کو بچانے کے لئے دوڑی ہے جو جہاز کے کنارہ پر چڑھ گیا تھا اور قریب تھا کہ وہ سمندر میں گر پڑے۔ اس وقت مجھے ثابت ہوا کہ اسی عورت کے پریشان خیالات اور وحشت احساس کا اثر میرے دل پر پڑا ہے اور وہ پہلے اسی کے دل میں پیدا ہوئے ہیں۔

بارہا مجھے اس بات کا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ ہوا ہے کہ جو خیال میرے دل میں زور سے آیا ہے اس کا اثر میرے قرب و جوار کے لوگوں پر پڑا ہے۔ جب میرے دل میں عورتوں کے پردے کے متعلق زوردار خیال تھے۔ تو اس وقت حیدر آباد تو کیا تمام ہندوستان میں یہ خیال پھیل گیا تھا اور پھر اس کا اثر مصر۔ ترکی وغیرہ دور دراز ملکوں تک پہنچا تھا۔ اور جب یہ خیال میرے دل سے چلا گیا۔ تو میں نے

دیکھا کہ وہ دوسرے لوگوں کے دلون سے بھی کم ہوتا گیا۔ اسی طرح جب میرے دل میں خدا کا خیال زوردار ہوا تو میں نے دیکھا کہ اس کا اثر تمام گھر پر پڑا اور جس جلسہ اور مجلس میں جاتا تھا۔ وہاں بغیر میرے ذکر چھیڑے ہوئے خدا کا ذکر چھڑ جاتا تھا۔

ان واقعات سے بخوبی ثابت ہے کہ ایک شخص کے خیالات اور احساس دوسرے لوگوں کے دلون میں منتقل ہوتے ہیں اور ان کا اچھا اور بُرا اثر ان پر پڑتا ہے۔ اسی واسطے کہا گیا ہے کہ اولیا اقدس کی صحبت سے انسان کو بہت فائدے پہنچتے ہیں اور وہ صبغۃ اللہ کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ جس سے زیادہ کون اچھا رنگ ہے اور اسی اصول پر ایک ولی کی پہچان یہ قرار پائی ہے کہ جب تک اس کی صحبت میں بیٹھیں اتنی دیر تک تمام دنیوی خیالات سے دل پاک صاف رہے اور دل میں خدا کا خیال خود بخود پیدا ہونے لگے۔ اگر یہ بات کسی پیر کے پاس بیٹھنے سے حاصل نہ ہو۔ تو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ مصنوعی پیر ہے۔ اور اسکے دل میں خدا کی محبت نہیں بلکہ دنیا اس کے دل میں گھر کئے ہوئے ہے دنیا میں نئے خیالات پیدا کرنے والے لوگ بہت ہی کم ہیں اور نیا خیال شاذ و نادر ہی کسی کے دماغ میں آتا ہے۔ عموماً لوگوں کے دلون میں وہی خیالات آتے ہیں جو ان کے اطراف و جوانب بھرے ہوئے ہیں۔ کوئی انکا ذاتی خیال نہیں۔ جب ہم کوئی خیال

پیدا کرتے ہیں تو وہ اس مجموعہ خیالات میں مل جاتا ہے جسکو بنی نوع انسان نے پیدا کیا ہے۔ عقل مند آدمی وہ ہے جو اپنے دل اور دماغ کو اعلیٰ درجہ کے خیالات میں لگائے رکھتا ہے اور اسکو ایسا تربیت کرتا ہے کہ وہ پاکیزہ اور بلند خیالات ہی کو جذب کرے اور نیچے اور پست خیالوں کو اپنے پاس بھٹکنے نہ دے۔ اس اکتساب اور تربیت سے اس کا دل و دماغ ایک فیلڈ یا چھلنی جلابیگا جو بُرے خیالوں کو دور کر دے گا۔ اور اچھے خیالات کو لے لیگا۔ اور اس تدبیر سے اس کا دماغ دوسروں کے خیالات بد کے اثر سے ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ کاطین اولیاء اللہ نے اس غایت کے حاصل کرنے اور بُرے افراط سے محفوظ رہنے کے لئے طرح طرح کے ذکر و شغل اور مراقبات بتائے ہیں جن سے بہت ہی کم اشخاص فہمستی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

عالم مثال یا آخرت کا وجود حقیقی ہے

ہم لوگ عموماً اس مادی دنیا ہی کے کاروبار میں مستغرق ہیں اور اپنی ساری ہمت اور توجہ ہمہ تن اسی کی طرف متوجہ رکھتے ہیں۔ اسلئے ہم لوگوں پر عالم مثال کا کھٹنا اور ہمو اس میں رسائی پیدا کرنی بہت دشوار ہے۔ ہمارے حواس خمسہ مادے اور تعینات کی بیڑیوں میں اس قدر جکڑے ہوئے ہیں کہ وہ ایک دم بھی ان

دنیوی زنجیروں سے رہائی نہیں پاتے۔ اس لئے ہم عالم مثال کی اشیا کو نہ تو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں اور نہ اس کی آوازوں کو اپنے کانوں سے سن سکتے ہیں اور نہ اسکی بو کو اپنی ناک سے سونگھ سکتے ہیں اور نہ اسکی لطیف اشیا کی سطحوں کو چھو سکتے ہیں۔ گو ہم اس حقیقی عالم کو اپنے حواس سے ادراک کر سکیں اور اس کی لطیف چیزوں کی نازک تحریک ہمارے ہمتے اور کثیف اعضا سے احساس تک نہ پہنچے۔ تاہم اس عالم کی واقعیت اور اصلیت میں کوئی شک و شبہ نہیں۔

سب کو معلوم ہے کہ ہسینے کی بعض تاریخوں میں چاندون کو دکھائی دیتا ہے۔ اس وقت ہم اس کے برت جیسے دھندلے جرم پر نظر تو ڈالتے ہیں۔ مگر ہمارے دل میں یہ خیال کہہ نہیں آتا کہ چاندنی اس وقت بھی موجود ہے جیسی کہ وہ گزشتہ رات کو تھی۔ اس وقت ہم دھوپ ہی کو دیکھتے ہیں جس کی تیز روشنی سے وہ چھپی ہوئی ہے۔ مگر شام کو جب آفتاب خون آلودہ شفق میں ڈوب کر ہماری نظروں سے غائب ہو جاتا ہے۔ تو اس وقت فوراً چاندنی دکھائی دینے لگتی ہے۔

دن میں بھی چاند کی نازک اور ٹھنڈی شعاعیں ہم پر پڑتی رہتی ہیں۔ مگر ہم اس وقت انہیں دیکھتے نہیں۔

یہی حال عالم مثال کا بھی ہے۔ وہ اس وقت ہمارے اطراف و جہاں اور اندر موجود ہے اور اپنا پورا اثر ہم پر ڈال رہا ہے۔ مگر ہم اس نادیدنی دنیا کی طرف اس قدر متوجہ ہیں کہ ہم کو وہ محسوس ہی نہیں

ہوتا۔ جب ہم اپنے دل کو دنیا کے کاروبار سے ہٹاتے ہیں اور اپنے ظاہری حواس کو بند کرنے کا فن سیکھ لیتے ہیں اور اپنے نفس کو باتین کرنے سے تھوڑی دیر کے لئے روک دیتے ہیں۔ یعنی حدیث نفس کو روکتے ہیں۔ تو اس وقت عالم مثال یا آخرت کا دروازہ کھلتا ہے اور ہم اُدھر کی چیزوں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس موقع پر کسی ہندی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ ”بہتر کے پٹ جب کہلین جب باہر کے پٹ دے“ یعنی حواس ظاہری کے بند کرنے سے حواس باطنی کھلتے ہیں۔ اور عالم آخرت نظر آتا ہے۔

سونا اور خواب دیکھنا

خوش قسمتی سے ہم اپنے گمان سے زیادہ اس عالم مثال سے واقف ہیں۔ ہم اس عالم میں جاتے ہیں اور اس کی چیزوں کو دیکھتے ہیں پھر بھی ہم اپنے دہم و خیال سے اس کے وجود کے منکر ہیں۔ جب ہم سو جاتے ہیں۔ اُس وقت ہم اپنی مثالی وجود کا جامہ پہنکر جو اسی عالم مثال کے لطیف مادے سے بنا ہے اس جسم کثیف سے باہر جاتے ہیں اور اس عالم کے مختلف مناظر کی سیر کرتے ہیں اور اس کی مجلا اشیا کو دیکھتے ہیں۔ جو بذاتہ روشن اور نورانی ہیں۔

سوالکین کے لئے یہ خواب کوئی رازِ سربستہ نہیں ہے۔ وہ اس کو

خوب سمجھتے اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مگر ہم لوگ اس بادی جسم ہی کو بذاتہ کوئی شے جانتے ہیں اور اسی کو اپنا وجود مطلق خیال کرتے ہیں اور روح کو اسکی ترکیب کیمیاوی کا نتیجہ جانتے ہیں اور اسکو بذاتہ قائم و دائم نہیں سمجھتے اور یہ گمان کرتے ہیں کہ دماغ اور دل کے وجود پر افعال روحانی اور احساس اندرونی منحصر ہیں اسلئے جب تک ہمارے یہ غلط خیالات دور نہ ہوں گے۔ جنہیں حکمائے مادیین نے اپنی غلط فہمیوں سے پیدا کیا ہے اس وقت تک ہم عالم مثال یا خواب کو کبھی سمجھنے کے قابل نہ ہوں گے۔ گو ہزار دہی دلیوں اور خیالی تو جیہوں سے خواب کی تاویل کریں۔ مگر واقعیت اور اصلیت کے مرکز سے ضرور دور رہیں گے

مگر خواب کا مسئلہ بہت سیدھا سادہ ہے۔ جب ہمارا دماغ بے حس یا غافل ہو جاتا ہے اور ہمارے حواس ظاہری دنیا کے احساس سے معطل ہو جاتے ہیں تو ہم قالب مثالی کے ساتھ عالم غیر مری میں داخل ہوتے ہیں جو ہمارے اطراف و جوارب موجود ہے اور ہم وہاں کے سیر و تماشا دیکھتے ہیں۔ اس وقت بھی ہمارا ادراک اور آگاہی وہی ہوتی ہے جو جاگنے میں تھی یعنی روح وہی رہتی ہے۔ مگر ایک جسم لطیف کو اختیار کر لیتی ہے۔ یعنی جسم کثیف کو چھوڑ کر جسم لطیف کا جامہ بھینتی ہے۔ روح کے ان دونوں قابوں میں البتہ فرق ہیں ہے۔

جب ہم سو جاتے ہیں اور عالم مثال میں داخل ہوتے ہیں۔ تو اس وقت اس عالم مادی میں ہماری روح حیوانی اس قالب جسمانی کو قائم رکھتی ہے اور اس غیبت میں اس کے تمام سلیز یعنی ذرات اپنی غذا لیتے اور کام کی تھکاوٹ دور کرتے ہیں۔ اور جو کچھ حالت بیداری میں طاقت اور مادہ زائل ہوا تھا اسکو پھر پھیر لیتے اور تازہ کرتے ہیں۔ الغرض روح حیوانی کی مدیر اور انتظام سے ہمارا جسم حالت غفلت میں پھر تروتازہ ہو کر کام کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور ہم کھوئی ہوئی طاقت اور نور کو از سر نو حاصل کرتے ہیں۔

جب ہم اس خواب غفلت سے پھر چونکتے ہیں تو تمام اعضا جسم پھر ہمارے حکم کو مستعدی کے ساتھ بجا لاتے ہیں اور دیر تک کام کرنے کے بعد پھر وہ تھک جاتے ہیں اور پھر انہیں آرام لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب یہاں سے یہ بات خوب واضح ہے کہ ہماری روح کے چلے جانے سے جسکو ہم خواب کہتے ہیں اس جسم کثیف کو راحت ملتی ہے۔ تو گویا جب تک ہم عالم مثال میں رہتے ہیں۔ اس وقت تک یہ جسم مادی آرام و راحت پاتا ہے

بعض اوقات جب ہم نیند سے چونکتے ہیں تو ہم اپنی سیر کو جو سونے میں کی تھی یاد کرنے کی بہت کوشش کرتے ہیں۔ اور دلغ پر بہت زور ڈالتے ہیں کہ وہ یاد آجائے۔ مگر وہ ذہن میں نہیں آتی۔

اگر وہ سیر یا درہی تو ہم اسکو خواب کہتے ہیں۔ درحقیقت خواب جو ہمیں یاد رہتا ہے وہ قوت حافظہ کا ایک فعل ہے۔ کیونکہ بہت سے واقعات ہم زندگی میں دیکھ کر بھول جاتے ہیں اسی طرح سونے کی حالت میں ہم سب علم مثال کی سیر تو ضرور کرتے ہیں۔ مگر اس سیر کے واقعات ہمیں دماغ کی کمزوری کے سبب سے یاد نہیں رہتے۔ اگر ہم اپنے دماغ کو اس طرح تربیت کریں کہ وہ عالم مثال کی سیر کو بخوبی یاد رکھا کرے تو ہمیں وہاں کے کھیل تماشے اور واقعات سب کے سب یاد رہیں گے۔ اور اگر ہم اپنے ادراک یا آگاہی کو اس قدر وسیع کریں کہ وہ عالم مثال تک کی خبر لاسے۔ تو اس وقت یہ کہا جائے گا کہ ہم پر عالم مثال کھل گیا اور ہماری رسانی اس غیر مری عالم تک ہو گئی۔ عالم مثال کے دیکھنے کی قوت ہر شخص میں موجود ہے۔ صرف تعلیم و تربیت ہی کی ضرورت ہے جو کامل پیر کی نگرانی میں ہی حاصل ہو سکتی ہے ناقص استاد یا پیر مریدوں کے قواسے دماغی اور جسمانی ہی کو برباد نہیں کرتے بلکہ ان کی اصلی قابلیت بھی خراب کر دیتے ہیں

اس زمانہ میں مرشدوں کی تو کوئی کمی نہیں۔ مگر اس بات کا دریا کرلےوام الناس کے لئے البتہ دشوار ہے کہ ان میں سے کتنے مرشدوں کی رسانی عالم مثال تک ہے۔

فصل ۲۔ ہم عالم مثال کو اپنی آنکھوں سے کیوں نہیں دیکھتے ہمارے اور عالم مثال کے درمیان پڑھیا حجاب

جب ہم کو معلوم ہو جاتا ہے کہ واقعی عالم مثال موجود ہے۔ اور ہم رات کو روزانہ سونے کے بعد اس کی سیر کرتے ہیں اور ہمو دمان کے واقعات اس لئے یاد نہیں رہتے کہ ہمارا دماغ ہمارے یاد رکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور ہمارے دماغ اور اعصاب میں اس کے احساس کی قوت پیدا نہیں ہوئی۔ تو اس وقت ہمارے اور عالم مثال کے درمیان میں جو پردہ حائل ہے وہ مگر ہی کے جالہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اور ہم اس وقت اس حجاب کو بہت جلد دور کر دینا چاہتے ہیں اور اس کے اٹھا دینے کی کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ تاکہ ہم بیداری میں بھی اپنے ان ہوش و حواس کے ساتھ بھی اس عالم کی سیر کریں۔ مگر ہمیں اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ طلب علم کی خواہش شدید کی وجہ سے ہمیں کہیں مشکلات اور ناقابل برداشت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے۔ عام لوگوں کی نظروں سے جو عالم مثال پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ تو اسکی کوئی معقول وجہ ضرور ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں جیسا کہ قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے کہ امد عزیز و حکیم یعنی خدا قوت والا امد حکمت والا

کیونکہ اس حکیم مطلق نے اصول فطرت قائم فرمائے ہیں اور وہ بڑی عقلندی اور حکمت سے ان کی نگرانی کرتا اور انہیں برقرار رکھتا ہے۔

ایک مرتبہ میرا ایک لڑکا میرے پاس ایک کنول کا پھول لایا۔ وہ ابھی کھلنا جاتا تھا اور اس کے اندر کی خوبصورتی ظاہر ہونے لگی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ اس تازے پھول کو پانی میں رکھو۔ میں ہوا حوڑی سے واپس آتا ہوں۔ اس نادان لڑکے نے ہاتھ سے اس نیم واپھول کی پینکٹریوں کو کھول دیا اور اس کے کھلنے اور اندرونی خوبصورتی کے دیکھنے میں بہت جلدی کی۔ جب میں باہر سے گھر میں واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ پھول باوجود پانی میں رہنے کے بالکل مرجھا گیا تھا اور بعض پینکٹریاں پژمردہ ہو کر گر بھی گئی تھیں۔ اگر ہم بھی اپنے قواسمے دماغی یا دل پر جو کنول کے پھول کی طرح ہے۔ عالم مثال کو بزور کھولنے کے لئے حد سے زیادہ بار ڈالیں گے اور حجاب کے دور کرنے میں بہت جلدی کریں گے اور ایسے طریقوں اور اشغال کو عمل میں لائیں گے جو عقل سے بعید ہیں تو ہماری وہ دماغی قوتیں بھی اسی کنول کے پھول کی پینکٹریوں کی طرح جو بزور کھولا گیا تھا پژمردہ اور کمزور ہو جائیں گی جن سے ہم عالم مثال کی سیر کرتے ہیں۔ یہ کوئی عقل کی بات نہیں کہ ہم قواسمے دماغی اور نازک اعصاب پر ایک بہاری بوجھ رکھیں

جس سے وہ دبکر خراب ہو جائیں۔ ناوا جی اور غیر اصول کو شش اور سعی اور حد اعتدال سے زیادہ بار ڈالنے سے دماغ اور اعصاب کی بعض نازک ساخت بگڑ جاتی ہے اور دل اور دماغ عمر بھر کے لئے خراب ہو جاتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم عالم مثال کے بزور کہو لئے میں سعی ملین کرین ہمیں یہ زیبا ہے کہ ہم اس عالم اور اسکے کہو لئے کے طریقوں کے متعلق کتابوں اور مرشدوں سے صحیح معلومات حاصل کرین اور پہلے ان اصول اور طریقوں کو اچھی طرح سمجھ لیں جن سے عالم مثال کھل سکتا ہے اس کے بعد مجاہدے اور ریاضت شاقہ میں مصروف ہوں۔ ورنہ فائدہ کے عوض نقصان اٹھانا پڑے گا۔

اس زمانہ میں عوام الناس اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ علم تصوف اور فلسفہ الہیات کی کتابوں کے پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ صرف ذکر و شغل اور مجاہدے اور ریاضت ہی سے ہم عالم آخرت میں داخل ہو سکتے ہیں۔ علم تصوف کی یہ ساری کتابیں اور لیکچر بیکار ہیں اور اس عدم علم اور اس جہل مطلق کا نتیجہ یہ ہے کہ اول تو صد ہا جاہل اشخاص صرف روٹی کمانے کے لئے چند تصوف کی باتیں اور بعض اذکار طوطے کی طرح سیکھ کر مرشدین بیٹھتے ہیں اور پیری مریدی کا بازار گرم کرتے ہیں اور لوگوں سے نذرانے لیتے ہیں۔

ان کے مریدوں کی حالت یہ ہے کہ وہ معمولی اخلاق اور اکتساب

اعمال صالحہ سے بھی بے بہرہ ہوتے ہیں۔ بعض پیر لوگوں سے بیعت لیکر اپنے شجرے انکے ہاتھ بڑی قیمتوں پر فروخت کرتے ہیں جس سے ایک معقول آمدنی ہوتی ہے اور اس شجرے یا نسب نامہ کو یاد کرنے اور روز پڑھنے کا شغل بتاتے ہیں جس سے سچے نفع اوقات کے اور کچھ حاصل نہیں۔ بعض پیر جنہیں عالم مثال نہیں کہلا وہ دوسروں کو اس کے کہولنے کے عجیب و غریب ناقص طریقے بتاتے ہیں جن سے کوئی زیادہ فائدہ نہیں اور جب کوئی مرید غلبہ شوق میں انہیں حد اعتدال سے زیادہ کرنے لگتا ہے کیونکہ اکثر مریدوں کو رات دن ان اشغال کے جاری رکھنے کی ہدایت فرمائی جاتی ہے تو اکثر اعضائے جسمانی میں خلل آ جاتا ہے اور مرید یا یوس ہو کر ان اذکار یا اشغال کو ترک کر دیتا ہے۔ بعض لوگ اسی وجہ سے تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور اکثر مختلف ادھام اور خبط میں گرفتار پائے جاتے ہیں۔ یہ سب انہیں جاہل پیروں کا طفیل ہے جو خود کسی بات کو نہ جان کر دوسروں پر عالم آخرت کہو لہیٹے کے مدعی بنتے ہیں بعض جاہل پیروں نے یہ خبیثہ اختیار کیا ہے کہ اعتراض یا کسی مسئلہ تصوف کے پوچھنے پر خفا ہو جاتے ہیں اور طالب کو بحف کرنے سے روک دیتے ہیں تاکہ ان کی جہالت اور عدم واقفیت لوگوں کو معلوم نہ ہو جائے حالانکہ سب سے پہلے مرشد کامل کا فرض یہ ہے کہ وہ لوگوں کو مسائل تصوف کی تعلیم کوے اور انہیں ذکر شغل کے فوائد

سمجھائے۔ بعض پیر معمولی باتوں کو جو آجکل تمام اردو اور فارسی کتابوں میں درج ہیں اسرار مخفی ظاہر کر کے مریدوں کو تنہا مقام میں بتاتے ہیں اور پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ اسرار مخفی سینہ بسینہ پہنچے ہیں انہیں کسی پر ظاہر نہ کرنا۔

الغرض پیروں اور مریدوں دونوں کی عدم واقفیت سے آج کل اکثر خراب نتائج پیدا ہوتے ہیں اور لوگ عالم مثال تک ترقی کرنے سے محروم رہتے ہیں۔ ہاں بسنتی کپڑے پہننے مجالس سمع میں رقص کرنے اور دو چار اشعار کی مہل اور وہمی تاویلیں کرنے کی تو البتہ لیاقت حاصل ہو جاتی ہے جنہیں جاہل مریدین سن کر عیش عیش کرتے ہیں۔ یہ بہت ہی کم دیکھا جاتا ہے کہ کہیں مستند کتب تصوف کا درس ہو اور قرآن شریف کے اسرار منہوی بیان کئے جائیں جو دراصل فلسفہ تصوف ہے۔ اس لئے ہمیں اس بات کے بیان کرنے میں ذرا بھی باک نہیں کہ بغیر مطالعہ کتب تصوف اور مصحف پیر کمال کے کوئی باطنی انکشاف کا ہونا نہایت ہی دشوار ہے۔ کسی شخص کو زیبا نہیں کہ وہ عالم مثال کے کھولنے پر عجلت کو ساتھ زور دے اور حد سے زیادہ محنت اٹھائے جو موجب خوف و نقصان ہے۔

خوفناک مصنامین اور کتابین

یہ مناسب نہیں کہ ہم ہر ایک ہدایت اور طریقہ اشتغال پر عمل کرنے لگیں

جو کتابوں میں درج ہیں۔ کیونکہ بہت سی چھپی ہوئی کتابیں ایسی شائع ہوتی ہیں جن کے مصنف اور مولف فن تصوف سے ناواقف ہیں۔ اور جن کی ہدایتیں خوف اور ضرر سے خالی نہیں۔ اس زمانہ میں بھی گزشتہ زمانہ کی طرح لوگ روحانی ترقی کی طرف اکثراً تامل ہیں۔ اور عام میلان کی وجہ سے عام طور پر خواہ وہ علم تصوف سے واقف ہوں یا اس سے مطلق جاہل ہوں ایسی کتابیں طبع کر کے شائع کرتی ہیں۔ جن میں اکثر مشتبہ عبارات ہیں اور ناقابل اعتبار معلومات درج ہیں۔ بعض تصوف کی کتابیں تو ایسی نا سمجھی سے ترجمہ کی گئیں یا لکھی گئی ہیں کہ ان کا مطلب بھی سمجھ میں نہیں آتا۔

مسئلہ تو کچھ ہے اور مولف یا مترجم صاحب لکھ کچھ رہے ہیں۔ بعض کتابیں عوام الناس کو ہدایت کرنے کے لئے نہیں لکھی جاتی ہیں بلکہ روپیہ پیدا کرنے اور لوگوں کی اس خواہش کے پورا کرنے کے لئے بنائی جاتی ہیں۔ جو ان کے دلوں میں عالم آخرت کی نسبت پیدا ہوئی ہے۔

ان کتابوں کے مصنف ان میں وہ معلومات اور اشغال لکھتے ہیں جن سے یا تو وہ خود ہی ناواقف ہیں یا ان کے خوفناک ہونے یا لوگوں کو ضرر میں ڈالنے کی وہ ذرا بھی پروا نہیں کرتے۔ ان کتابوں کی اشاعت سے ان کا مقصد صرف اتنا ہی ہے کہ ان کی کتابیں فروخت ہوں اور کچھ قلیل نفع ہاتھ آئے۔ مردہ

چاہے جنت میں جائے یا دوزخ میں انہیں اپنے حلوے مانڈے سے کام۔ لوگ تصوف کی کتابیں سمجھیں یا نہ سمجھیں یا غلط فہمیوں میں پڑیں۔ انہیں ترجمہ کرنے یا لکھنے سے غرض ہے۔

بعض اشغال اور ریاضت کتابوں میں ایسے درج ہوتے ہیں جو معنی اور چیستان سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ اور بغیر استاد کے سمجھانے کے کوئی انہیں از خود نہیں سمجھ سکتا۔ اکثر علم تصوف کی عمدہ کتابیں بھی اس نقص سے خالی نہیں۔

اسکے علاوہ آجکل عربی اور فارسی زبانوں کی تعلیم اور تعلیم کار و اج کم ہو گیا ہے اور روز بروز کم ہوتا جاتا ہے۔ اسلئے ضرور ہے کہ ان مستند کتابوں کے مطالب سہل اور سلیس اردو زبان میں بیان کئے جائیں جو اس زمانہ کی رائج الوقت لسان ہے۔ مگر ان کتابوں کے ترجمہ میں بھی اور دقیق پیش آتی ہیں جو مترجمین کی عدم واقفیت سے پیدا ہوتی ہیں۔ اسلئے ہر ایک مستند کتاب کو خواہ وہ اردو میں ہو یا فارسی اور عربی میں کسی با عمل صوفی سے پڑھنا چاہیے جو عالم آخرت سے باخبر ہو اور جو ان کتابوں کے مطلب کو بخوبی ذہن نشین کر سکے۔ اس تدبیر سے لوگ جو اس راہ میں قدم رکھنا چاہتے ہیں اس کی دشوار گزار گھاٹیوں اور مضرت رسان سدراہوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

جب کوئی آتش بازی کا گولہ لانا چاہتا ہے۔ تو پہلے اس کے

خوفناک مصالحہ اور اجزاء سے واقفیت حاصل کرتا ہے۔ اور بہت کم کوئی نادان آدمی ایسا ملے گا جو باروت اور پھٹنے والی اشعار کو بغیر جانے بوجھے ترکیب دینے لگے۔ عقل مند آدمی سب سے پہلے جو کچھ مستند کتابیں اس مضمون میں لکھی گئی ہیں انہیں بغور مطالعہ کرے گا اور یہ دیکھے گا کہ اس بارہ میں کون مستند مصنف ہو جسکی تصنیفات سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ وہ کبھی انداماد ہند اس خوفناک اشعار کو ہاتھ نہ لگائے گا۔ مگر اس کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ لوگ عام پیروں کے ہاتھ پر محض شہرت خاندانی کی وجہ سے بغیر سوچے سمجھے کیوں بیعت کر لیتے ہیں اور وہ یہ نہیں دریافت کرتے کہ آیا اسکو بھی کوئی ذاتی علم اور تجربہ حاصل ہے۔ یا نہیں۔ اس بارے میں وہ نہ تو کسی واقف کار سے رائے لیتے ہیں اور نہ کسی علمی کتاب سے مدد طلب کرتے ہیں۔ قبل اسکے کہ انہیں تصوف کے سید ہے سادہ مسئلے معلوم ہوں۔ وہ عالم مثال کے کہوئے اور اس پیچیدہ اور پر خوت گہائی کو طے کرنے کے لئے آمادہ ہوتے ہیں اور اپنی رائے اور وہم پر پورا وثوق رکھتے ہیں۔ بجز عدم واقفیت اور جہالت کے اس نادانی اور خود رانی کا اور کوئی سبب معلوم نہیں ہوتا۔ یہی سبب ہے کہ ان ملکوں میں اکثر اشخاص منحوظ اور محبوب پائے جاتے ہیں جنہیں لوگ نا فہمی سے مجازیب کہتے ہیں۔ حالانکہ غلط اکتساب اور ناقص معلومات سے ان کے قواسم دماغی میں فتور

پیدا ہو گیا ہے۔

عقل سلیم اور عام فہمی سو کام لینا چاہئے

عالم مثال کے کاروبار میں بھی ہمیں اپنی عقل اور فہم سے کام لینا چاہیئے جس سے ہم دنیوی معاملات میں کام لیا کرتے ہیں۔ عالم مثال کے کسی واقعہ کو اسی طرح عقل و فہم سے سمجھنا چاہیئے اور اس کو اسی طرح فہم و فراست سے جانچنا چاہیئے جیسے کہ ہم ایک خط کو مصنوع یا ایک مقدمہ عدالتی کو جانچتے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم ان واقعات غیبی میں خوش اعتقاد می اور بے عقلی کے تابع ہوں اور جو کچھ ہم دیکھیں اس کی صداقت پر عزت و تعظیم سے سر جھکا دیں۔ برخلاف اس کے ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنے عالم مثال کے تجربہ اور مشاہدے کی اچھی طرح جانچ اور پرتال کریں اور جو کچھ تو اسے عقلی خدا نے ہمیں دے دیا ہے ان سے یہاں بھی پورے طور سے کام لیں۔

ہمیں معلوم ہے کہ بہت سے فہمیدہ اشخاص اس کٹھن راہ میں وہم و خیال میں بڑکھڑاہے اور تباہ ہوئے ہیں اور ان کی سمجھ بوجھ اور ذہانت اور متانت اور قوت فکر بگاڑ گئی ہے۔ وہ اپنے معمولی خواب کو ایک عجیب و غریب واقعہ خیال کرنے لگے ہیں اور اپنے ہی وہم و خیال کی کارروائیوں کو شیا طین اور جنات

کے اثرات تصور کرنے لگے ہیں۔ وہ انتہا درجہ کے وہمی اور خیالی آدمی ہو گئے ہیں اور بات بات میں ارواحِ خبیثہ اور جادو ٹوٹنے سے ڈرنے لگے ہیں اور اپنے ذہن میں یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ اولیاء اللہ یا رسولوں کی ارواح انہیں تعلیم دیتی ہیں اور وہی اور خیالی آوازوں کو وہ فرشتوں کی آوازیں جانتے ہیں۔ ایسے بگڑے ہوئے سالکین کو از سر نو راہ پر لانے کے لئے ایک عرصہ دراز کی ضرورت ہوتی ہے اور مرشدِ کامل ہی انہیں دوبارہ راہِ راست پر لاسکتا ہے اور انہیں یہ باور کرا سکتا ہے کہ اپنی لیاقت سے زیادہ اپنے آپ کو تصور نہیں کرنا چاہیے۔

من عرف نفسه فقط عرف ربہ

خود شناسی اور خدا شناسی کے بہت سے طریقے اور عمل موجود ہیں ان میں سے بعض تو معقول اور بعض نامعقول ہیں۔ یعنی اکثر فضول اور بے نتیجہ ہیں۔ جو شخص اپنی معرفت حاصل کرنا چاہتا ہے اس پر فرض ہے کہ وہ اُس نصیحت پر عمل کرے جو سقراط حکیم نے اپنے شاگردوں کو دی تھی۔ اور جو ایک یونانی مندر کے دروازہ پر کندہ ہے جسکو ذیلیقی کہتے ہیں۔ وہ نصیحت یہ ہے کہ ”اے انسان تو آپکو پہچان“

اس بات کو قرآن شریف میں بھی جا بجا بیان فرمایا گیا ہے

چنانچہ ایک جگہ لکھا ہے کہ **و فی انفسکم افلا تبصرون**۔ اور تم اپنے آپ میں کیوں نہیں دیکھتے۔ اس سے یہ مطلب ہے کہ خود شناسی سے خدا شناسی حاصل ہوتی ہے۔

مگر خود شناسی کوئی سہل بات نہیں۔ اس کے لئے برسوں کی محنت اور ریاضت درکار ہے مدتوں آدمی جب دل کو دنیاوی افکار سے خالی کر کے تنہائی میں بیٹھتا اور مراقبہ کرتا ہے۔ تب اسکو کبھی خود شناسی حاصل ہوتی ہے۔ جب کوئی خدا کی راہ میں بے غرض مخلوق کی کوئی خدمت اختیار کرتا ہے اور اس کو اپنا فرض منصبی جان کر برسوں انجام دیتا ہے تو اس وقت اسکو اس اعلیٰ مقصد کے حاصل کرنے میں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ جب ہم دوسروں کی منفعت اور بے غرض خدمت کرتے اور انہیں فائدے پہنچاتے ہیں۔ تو اس وقت ہمارے دل میں نور حق پیدا ہوتا ہے اور ہماری اندرونی قوتیں ترقی کرتی ہیں۔ انسان کی فطرت بہت گہری ہے جسکا امتحان ہم نے کبھی نہیں کیا۔ اس کی قوتیں پوشیدہ اور مخفی ہیں۔ جن سے ہم ناواقف ہیں۔ اسکے قواسم روحانی اور نفسانی کا دائرہ بہت ہی وسیع ہے جسکا ہمیں کافی ادراک نہیں۔ ہم ایسے مدارج اور عالموں تک ترقی کر سکتے ہیں جن کے وجود کا علم بھی ہمکو نہیں گو عموماً الناس خود شناسی کے حصول میں عاجز ہیں۔ مگر سالکین راہ خدا خود شناسی کی تمام منزلوں کو طے کرتے ہیں اور زندگی کے اعلیٰ

اے مقصود تک پہنچتے ہیں جس شخص کو یہ درجے پہنچاؤد مشناسی ہاتھ
آیا جو اس دنیا میں بار بار آنے جانے کا مال کار یا آخری نتیجہ ہے تو اسکو
مقصود حیات حاصل ہوا اور وہ سعادت دینوی و اخروی مسکے عروج
یعنی معراج معرفت کے آخری مقام پر پہنچ گیا۔

قبل از وقت عالم مثال کا کھلنا

عوام الناس پر عالم مثال جو نہیں کھلا ہے تو اس میں بھی خداوند تعالیٰ کی
بڑی حکمت ہے۔ اگر کسی دنیا دار آدمی پر وقتاً عالم مثال کھول دیا جائے
اور اس عالم کے قوی اثرات اسکے ضعیف دل پر ایکبار لگی پڑنے لگیں
تو یہ آدمی کسی کام کا نہ رہے گا اور اسکی قیمتی زندگی خراب ہو جائے گی۔
حق تعالیٰ احکیم اور قدیر ہے۔ اگر اسکے احکام اور قوانین قدرت کی پیروی
کی جائے گی تو وہ ہمکو اس عالم میں اُس وقت داخل ہونے کی اجازت
نہ دیگا۔ جب تک ہم اس عالم کے اثرات اور کششوں کے برداشت و
تحمل کی پوری قابلیت نہ رکھیں گے۔ قابلیت پیدا ہونے سے پہلے
عالم مثال کے کھلنے کی خواہش کرنی خوف و مضرت سے خالی نہیں
اگر کوئی شخص کسی ناواقف پیر کی رائے سے عالم مثال کو بزور اور قہر
سے پہلے کھولنے اور اس میں داخل ہونے کی حد اعتدال سے زیادہ
 سعی و کوشش کرے گا تو ضرور اپنی موجودہ زندگی کو خراب کرے گا اور
کئی قسم کی آفتوں اور سوء المزاجی میں گرفتار ہو جائے گا۔

پہلے ہمیں اس عالم ناسوت یا مادی دنیا کے فضائل یعنی بہت جرات
 قوت دماغی یا ارادی۔ بے غرضی۔ پاک نفسی۔ دانائی یا حکمت۔ محبت
 یا عشق وغیرہ تو حاصل کر لینے چاہیئے۔ تب عالم مثال میں پہنچنے کی خواہش
 کرنی چاہیئے۔ ابھی تو اس عالم کی یہ خوبیاں ہی حاصل نہیں ہوئیں کہ
 ہم سیرِ طریقی کے آخری مقام کی کوشش کرنے لگے۔ **مصرح**
 تو کارزمین رانیکو ساقی کہ بر آسمان نیز بہ دا نحق

عالم ناسوت کی سیر سے تو فراغت ہی نہیں ہوئی کہ عالم مثال کی طرف
 دوڑے۔ وہاں جا کر کس بات کو تحقیق کریں گے جبکہ اس عالم ہی سے
 بالفعل جاہل ہیں جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ان پر بہت جلد عالم مثال کھل جائے
 تو ان کی حالت اس سیاح کی سی ہے جو بغیر زاد راہ اور ضروری سامان
 کے افریقہ کے مقامات وسطیٰ میں گھس جائے۔ جہاں سوارِ گستان اور
 مردمِ خوارِ اقوام کے اور کچھ نہیں اپنی اس عجلت کا مضر نتیجہ اس وقت
 معلوم ہو گا جب چاروں طرف سے وحشی آدمی اس پر حملے کریں گے
 اور وہ ان کی زد کو بچانہ سکے گا۔ اس سفر اور سیاحت سے تو یہی بہتر تھا
 کہ وہ اپنے گھر میں آرام سے پڑا رہتا۔ اور اپنی موجودہ قوتوں اور
 اعضا ہی سے فائدہ اٹھاتا۔ اگر ہم نفس کشی۔ صفائی قلب اور اکتساب
 فضائل ہی کی طرف متوجہ رہیں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ ہم قابلیت اور
 تیاری کے پہلے عالم مثال میں داخل ہونے کی سعی بلیغ کریں۔ اور
 پھر اس محنت اور کوشش میں ناکام رہیں۔

عالم مثال کے اثرات

عالم مثال کے خطرات اور پر خوت اثرات میں سے یہ بھی ہے کہ ایک ناقابل اور نا اہل شخص پر جب عالم مثال کھل جاتا ہے تو اکثر ارواح خبیثہ جو مرنے کے بعد طبقات اسفل میں ہیں اوپر چلے کرتی ہیں اور اپنے مختلف اثرات ڈالتی ہیں۔ یہ بیچارہ اس وقت ان کے بُرے اثرات سے اپنے آپکو بچا نہیں سکتا۔ دنیا میں تو ہم پولس اور عدالت کے ذریعہ سے کسی مجرم سخت کی مضرتوں سے بچ سکتے ہیں اور اس کی ایذا رسانی سے بچلکے یا محبس کے توسط سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ مگر ان مجرمین ارواح کی زد سے بچنا سخت دشوار ہے جو مرنے کے بعد از کتاب جرائم پر اور بھی دلیر ہو جاتی ہیں اور جو ہم سے دور و دراز مقاموں پر موت کی وجہ سے چلی نہیں جاتیں۔ جو اشخاص اس زندگی میں نیک اور پرہیزگار ہیں وہ مرنے کے بعد عالم مثال کے اعلیٰ طبقات میں رہتے ہیں۔ مگر بدکار اور گنہگاروں کی رو حیں اس غیر مرغی عالم کے اسفل طبقات میں جو اس زمین کے متصل ہیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ شراب خوار بد معاش۔ چور اچکے۔ قاتل۔ ڈاکو وغیرہ مجرمین کی ارواح خبیثہ انہیں مقامات میں چکر کاٹتی پھرتی ہیں اور ان بدکاروں اور ناپاک لوگوں کے اجسام میں داخل ہوتی ہیں جو دنیا میں مبتلا سے افعال بد میں وہ ان مجرمین کے اندر گھس کر انہیں جرائم پر اور بھی دلیر کر دیتی ہیں۔

اور انہیں ہر ایک بد افعالی کے ارتحباب کی تحریص اور ترغیب دیتی ہیں۔ جن اشخاص پر قبل از وقت عالم مثال کھل جاتا ہے وہ ان ارواح خبیثہ کے اثرات کے اندر آ جاتے ہیں اور چونکہ ان میں اپنے بچانے کی پوری قوت نہیں ہوتی اس لئے وہ ان اثرات سے موثر ہو جاتے ہیں۔ اس لئے یہ عالم مثال کا کھلنا بعوض فائدہ کے انہیں سخت نقصان اور خوف میں ڈالتا ہے۔ مرشدوں کو چاہیے کہ سالکین کی استعداد اور قابلیت کے بموجب انہیں تعلیم دین ورنہ عالم مثال کے جلد کھلنے میں سخت خطرہ ہے۔

دوسری وجہ اسکی کہ کیون خداوند تعالیٰ نے عوام الناس میں عالم مثال کے ملاحظہ کی نظر نہیں دی یہ ہو کہ ہمارے اطراف و جوانب ایسی ایک مخلوق موجود ہے جو ہم سے خلقت میں ناقص ہے اور جسکو ہم جن کہتے ہیں۔ یہ ادنیٰ درجہ کے مخلوق عموماً انسان کے دشمن اور مخالفت ہیں۔ یہ جن بھی عالم مثال کے اسفل طبقات میں رہتے ہیں اور وہ اس وقت تک کسی شخص کو نہیں مٹاتے جب تک کوئی شخص کسی نہ کسی حیثیت اور حالت سے ان کے قریب نہ ہو۔ اگر کوئی ناقابل شخص عالم مثال کے کھولنے میں بے اعتدالی اور جلدی کرے گا تو ضرور اسکو اس ادنیٰ درجہ کے مخلوقات سے سابقہ ہوگا اور وہ ان کی مصرتوں سے نقصان اٹھائے گا۔

اس میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ جب ہم عالم مثال کھانچا ہے۔ تو

ہمارے احساس باطنی بہت تیز ہو جاتے ہیں اور ہم ان خیالات -
 احساس اور پر جوش خطرات سے آگاہ ہو جاتے ہیں جو ہمارے اطراف
 عالم مثال میں موجود ہیں - واقعی ہم خیالات اور احساس کے اس دریا
 عمیق میں غرق ہیں جنہیں ایک شہر یا مقام کے اشخاص ہر آن اپنے
 دماغوں اور دلوں سے پیدا کیا کرتے ہیں اور ان خیالات کا اثر ہم پر پڑتا
 تو رہتا ہے - مگر ہم ان اثرات سے واقف نہیں - لیکن جب عالم مثال
 ہم پر کھلنے لگتا ہے تو ان خیالات کا اثر بھی محسوس ہوتا جاتا ہے - اس
 وقت اگر ہماری قوت ارادی قوی نہ ہوگی اور ہم نفس کشی اور لغوے و
 طہارت سے اپنے دل کو پاک و صاف نہ رکھیں گے - تو ان خیالات
 اور احساس بد کے اثرات سے زیادہ تر متاثر ہونگے اور پھر ان کے
 قابو میں آکر نقصان اٹھائیں گے کیونکہ شہروں اور قصبوں کے اکثر
 اشخاص حریص - خود غرض - بے ایمان - جموٹے ناخدا شناس
 بد لالینے والے حاسد و غیرہ ہوتے ہیں اور ان ناپاک خیالات کا منہمک
 ہمارے اطراف موجود رہتا ہے - تو ایسی صورت میں جبکہ ہم پر عالم مثال
 کہلتا ہے یہی بخش خیالات مختلف شکلوں اور رنگوں میں ہمیں دکھائی
 دیتے ہیں - بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی عمدہ خیالات اور خوب صورت
 اشکال ہمارے سامنے آئیں کیونکہ بے غرض محبت اور فائدہ رسانی دنیا
 میں کیا ہے -

حفاظت کرنیوالا پردہ

سالکین نے ایک حجاب دریافت کیا ہے جسکی وجہ سے انسان اُن آفتوں سے محفوظ رہتا ہے جو عالم مثال کے بے وقت کھلنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ پردہ سید ہا سادہا مگر بہت ہی نتیجہ خیز ہے۔

علم برق کے ماہرون کو تجربہ اور مشاہدے سے معلوم ہو چکا ہے کہ جب اُن دو تاروں کے سروں پر موم لگا دیا جاتا ہے جن میں برق بھری گئی ہے۔ تو پھر اُن تاروں کے سروں کے ملا دینے سے برق کا شعلہ پیدا نہیں ہوتا مگر جب ان سروں کا موم دور کر دیا جاتا ہے یا کم از کم ان میں ایک سوراخ ہی کر دیا جاتا ہے تو فوراً آگ کا شرارہ (جنگاری) اٹھنے لگتا ہے۔

وقت برق کی طرح انسان کے اندر بھی اس قوت یا اعضاے مثالی کی حفاظت کی گئی ہے جس سے سالکین پر عالم مثال کا انکشاف ہوتا ہے انسان کے اس جسم کثیف اور لطیف یعنی ایتھریک میں کئی مرکز موجود ہیں جو عالم مثال سے اتصال رکھتے ہیں۔ یہ مرکز کچھ اس طرح پر ترتیب دئے گئے ہیں کہ ایک مثالی مرکز ایک جسمانی یا ایتھریل مرکز سے چپان یا متصل ہے۔ جب مثالی مرکز کا پورا اثر جسمانی مرکز پر پڑتا ہے اور آخر الذکر اول الذکر کے تابع ہو جاتا ہے۔ تو اس وقت آدمی کو عالم مثال کھل جاتا ہے۔ بعض اوقات خاص امراض کی

تکالیف حاصل اور مخصوص صدمات اور ذکر و شغل میں نہایت ہی اہمک کے سبب سے بھی عالم مثال دفعتاً کھل جاتا ہے جسکو قبل از وقت کہہ سکتے ہیں۔

مگر خداوند تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے ان مثالی اور جسمانی مرکزوں کے درمیان میں ایک نہایت ہی باریک اور نازک پردہ قائم کیا ہے۔ جو ایک عالم کے اثرات کو دوسرے عالم میں دفعتاً پہنچنے میں سد راہ ہے اور اس پردے میں سے صرف قوت جان جسکو وائیل فورس کہتے ہیں گزر سکتی ہے اور دوسری قوتیں یا فورس گزر نہیں سکتیں جیسے کہ شیشہ میں سے صرف شعاعیں ہی گزرتی ہیں اور دوسرے اثرات مثلاً گرمی و سردی وغیرہ نہیں گزر سکتیں اگر یہ حجاب جو مثالی اور جسمانی مرکزوں کے مابین حائل ہے دور کر دیا جائے تو ہر شخص پر عالم مثال کھل سکتا ہے۔ مگر خداوند تعالیٰ کی حکمت اور مہربانی ہے کہ عوام الناس سے یہ حجاب دور نہیں کئے جاتے جو اس عالم کے دیکھنے کی قابلیت نہیں رکھتے۔

مگر بد قسمتی سے یورپ اور امریکہ میں بعض ایسے طریقہ رائج ہیں جن سے عالم مثال بہت جلد کھل جاتا ہے۔ اور وہ ان چونکہ مرشد کامل کا قحط ہے اسلئے اکثر سالکین مجنوں اور مجنون ہو جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آج کل ان ملکوں میں پاگلوں کی تعداد روز بروز زیادہ ہوتی جا رہی ہے ہندوستان میں علم باطن کا اکتساب ہزاروں برس سے چلا

آ رہا ہے۔ اور باطنی علوم کے صمد یا مرکز یا مقامات جیسے خانقاہیں
مندر بت اور ہالیہ کی چوٹیاں وغیرہ اب تک موجود ہیں جہاں بیٹھ کر
سالکین راہ طریقت حاصل کرتے ہیں۔ ہند میں علم باطن کی ترقی
اس درجہ پر پہنچ چکی ہے کہ اب اسکو ایک مکمل اور باضابطہ علم یا سائنس
کہا جاسکتا ہے۔ علم باطنی اور علی الخصوص عالم مثال کے استحصا
ل کے جو طریقے یورپ اور امریکہ میں آجکل رائج ہیں وہ ہرگز خوف و
مضرت سے خالی نہیں۔

ہندوستان کے صوفیائے کرام اور مہاتما کبھی ان طریقوں کو پسند
نہیں فرماتے کیونکہ وہ علم باطن کو ایک نہایت ہی اعلیٰ درجہ کی
مفید اور کارآمد چیز جانتے ہیں اور وہ یورپ اور امریکہ کے اشخاص
کی طرح اُسے ایک تفریح اور کھیل تماشے کی شے خیال نہیں کرتے۔
اہل ہند کا خیال یہ ہے کہ یہی علم باطن لائق اشخاص کو بتانے سے
دنیا کو فائدہ کثیر حاصل ہوتے ہیں اور برخلاف اسکے نالایق اور بدطن
اشخاص کو جب یہی اسرار باطنی تعلیم کئے جاتے ہیں تو دنیا کو بہت
نقصان اور مضرت پہنچتی ہے۔

جو بکے صوفی اور سچے مہاتما ہیں وہ خود غرض اور نفس پرست
اشخاص کو اسرار باطنی تعلیم نہیں کرتے۔ کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ
بچے کے ہاتھ میں تلوار دیدینا کس قدر خطرناک ہے وہ اس جانگزا
آلہ سے صرف دوسروں ہی کو نقصان نہ پہنچائے گا بلکہ اپنے آپکو

بھی ہلاک کر لیا۔ نالایق اشخاص کو اسرار مخفی کی تعلیم سے بہت بڑا نقصان
 یہ عاید ہوتا ہے کہ وہ بیجا طور پر باطنی قوتوں سے کام لیتے ہیں جبکہ
 نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صد ہا سال تک ان کی رفتار ترقی روحانی میں خلل
 آ جاتا ہے۔ اور بچاے ترقی کے وہ غار پستی میں گرا دئے جاتے
 ہیں۔ اگر کسی لایق اور تجربہ کار مرشد سے باضابطہ اور باقاعدہ راہ سلوک
 کا طریقہ عملی طور سے سیکھا جائے تو اس میں ذرا بھی کوئی خوف و خطر
 نہیں۔ مگر مرید کو چاہیے کہ قرآن مجید کے اس فقرے کو ہر دم پیش نظر
 رکھے کہ رابطوا و صابروا یعنی خداوند تعالیٰ کے ساتھ ربط پیدا کرتے
 جاؤ اور صبر کرو اور اس کی رحمت اور فضل کا امیدوار رہو اور بے غرضی
 اور محنت کو اپنا شعار بنائے۔

فصل ۳۔ علم اشراق یا دوسروں کے ساتھ باطنی اسات

زندوں کے ساتھ باطنی تار برقی یعنی روشن ضمیری

جو خیالات یا خطرات ہمارے دل میں گزرتے ہیں وہ درحقیقت غیر مری
 دنیا کے ماسلات ہیں۔ یہ خیالات خواہ بناء ہمارے ہوں یا دوسروں
 کے سب عالم مثال کی تار برقیان ہیں۔ کیونکہ خیالات اور احساس
 اسی عالم میں پیدا ہوتے ہیں۔ جس طرح بے تار یا دائر لیس ٹیلیگراف

کا متوج چاروں طرف جاتا ہے یا ایک سمندر کی موجیں ہر طرف پھیلاتی ہیں۔ اسی طرح زوردار قلبی متوج بھی ہمارے چاروں طرف فضا میں موجیں مار رہا ہے۔ جو کچھ خیالات اور احساس ہمارے اس مادی تقبیل دماغ میں آتے ہیں وہ انہیں موجوں کے حقیقی اثرات ہیں جو دماغ تک پہنچنے میں بہت ہلکے پڑ جاتے ہیں گویا کہ عالم ملکوت سے جو تار برقی کا صدر اسٹیشن ہے ہمارے دماغ تک ہر آن تار برقیان پہنچا کرتی ہیں۔

ہر دماغ ایک ریڈیو نگ (تار لینے والی) اسٹیشن ہے جہاں عالم ملکوت کی تار برقیان وصول کیجاتی ہیں۔ اس بات سے تو بعض شخص خاص بخوبی واقف ہیں کہ ایک دل کے خیالات اور احساس دوسرے دل میں منتقل ہو سکتے ہیں مگر شاید اس کو بہت ہی کم لوگ جانتے ہوں گے کہ جو خیالات ہمارے دل میں گزرتے ہیں ان میں سے اکثر دوسروں کے پر جوش خیالات ہیں۔ اس بات کی تمیز بڑی مشکل ہے کہ ہمارے خاص اور ذاتی خیال کون ہیں۔ اور دوسروں کے کون ہیں ہمارے اطراف و جوانب کے اشخاص یا ایک شہر کے جم غفیر عوام الناس کے دلوں سے متواتر ہمارے دل میں باطنی تار برقی کے ذریعہ سے خیالات اور احساس آیا کرتے ہیں۔ مگر ہم ان خیالات کے اثرات سے جو ہمارے چاروں طرف سے ہم پر پڑ رہے ہیں ہم اسی طرح سے نادان ہیں جس طرح کہ کرہ ہوا کے دباؤ سے ناواقف ہیں جو ہمارے چاروں

طرف سے ہم پر پڑ رہا ہے۔ چونکہ ایک شہر کے باشندوں کی رایوں خیالات اور احساس کا اثر ہر دم باہم ایک دوسرے پر پڑ رہا ہے۔ اس سے ہر شہر اور ہر قوم کے خیالات اور احساس ایک خاص قسم کے ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان خیالات اور احساس کے اثرات سے لوگوں کو واقفیت تو نہیں۔ مگر ان کے زور دار ہونے میں بھی کسیکو کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ کوئی شخص رو سے زمین پر ایسا نہیں ہے۔ جو مقامی خیالات اور احساس کے اثرات سے بالکل محفوظ رہے۔ اور کچھ نہ کچھ اس کے دل میں دوسروں کے خیالات منتقل نہ ہوں۔ انتقال خیالات اور احساس کے ثبوت تو دنیا میں ہر وقت موجود ہیں۔ مگر ہم یہاں بعض مثالوں کو بیان کر دینا مناسب جانتے ہیں۔ نامک میں جب کوئی اچھا کھیل کیا جاتا ہے تو تمام تماشہ بین ایک دم سے تعریفوں کے غرے بند کرتے ہیں اور چاروں طرف خوشی کا جوش پھیل جاتا ہے۔ فٹ بال۔ کرکٹ۔ پولو۔ ٹورنمنٹوں میں عام جوش حرے اور چیر زکی شکون میں نمودار ہوتا ہے۔ مجالس نغمہ و سرود میں لوگوں کے سرور واہ واہ سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک کتاب پر جب اچھی رائے ظاہر کی جاتی ہے تو عام لوگوں کے دلوں میں اسکی وقعت اور خریداری کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ ایک مصور کی تصویر شارع عام پر دکھانے کی غرض سے رکھی جاتی ہے اُسکے دیکھنے کے لئے جوق جوق زن و مرد جمع ہو جاتے ہیں۔ ماتم اور اوزا

کی مجلس میں عام ٹپٹس پڑ جاتی ہے اور رونے کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ ڈنریا دعوت میں جب کوئی ماتمی لباس پہن کر یا کالا بازو باندھ کر آتا ہے تو سب کے دلون میں غلگین خیالات اور احساس پیدا ہو جاتے ہیں۔ جنازے کے ساتھ جلتے آدمی ہوتے ہیں ان سب کے دلون میں معنوم خیالات اور احساس پائے جاتے ہیں جب کوئی غصہ در ہمارے قریب ہوتا ہے تو ہمارے دلون میں بھی وحشت ناک خطرات گزرتے ہیں۔ ان تمام مواقع پر فی الواقع ہمارے دلون میں دوسروں کے خیالات اور احساس منتقل ہوتے ہیں۔ اور ہم بھی ان سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ باطنی تار برقی کی یہ بین مثالیں ہیں جن کی تکذیب کی کوئی بھی جرأت نہیں کر سکتا۔

انتقال خیالات میں احساس سے بچنے کی معقول تدبیر

یہ بات تو بخوبی سمجھ میں آگئی کہ اکثر ہماری خوشی اور رنج دوسرے اشخاص کی خوشی اور رنج کے پر تو یا عکس ہیں جو ہمارے اطراف و جواب موجود ہیں یا جن کی صحبتوں میں ہم دن رات اُٹھتے بیٹھتے ہیں یا جن سے ہمیں گہرا تعلق ہے۔ تو اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم ان واہی خیالات اور تخلیفات وہ احساس سے کیوں کر نجات پاسکتے ہیں اس سوال کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ ان غلگین احساس اور خیالات کا دور کرنا کوئی بڑی مشکل بات نہیں۔ جب وہ

تمہارے دل میں گزریں تو تم انہیں دور کر دیا کرو۔ اور اپنے دل میں یہ کہا کرو :- یہ ہمارے خیالات اور احساس نہیں ہیں۔ ہمیں کوئی وجہ نہیں کہ ہم ناخوش اور رنجیدہ ہوں ہمکو نہیں چاہیے کہ ہم ان خیالات کو اپنے اوپر قابو دیں۔ چلے جاؤ ہمیں تم سے کوئی سروکار نہیں۔ ہمارے اندر خدا کا نور ہے جو سرور اور خوشی کا پرتو ڈالتا ہے۔ ہم محبت اور خدا کی شناخت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔

بُڑے خیالات اور تکلیف دہ احساس کے دور کرنے کا سب سے سہل طریقہ یہ ہے کہ جب انسان کے دل میں غم اور غصہ کے خیالات اور احساس پیدا ہوں تو اسکو چاہیے کہ دل میں خدا کا ذکر کرے یا نماز پر کھڑا ہو جائے یا تسبیح پھیرے۔ بزرگان دین نے دسواں اور خطرات سے بچنے کے لئے بعض اشغال اور اذکار تراشے ہیں جو دلوں کو بُرے خیالات سے محفوظ رکھتے ہیں اگر کوئی شخص اپنی دل کو ان عام ناپاک خیالات سے بچانا چاہتا ہے جن کو سمندر میں وہ ڈوبا ہوا ہے تو اسکو چاہیے کہ کسی مرشد سے ذکر اور شغل کا طریقہ یا مراقبہ سیکھ لے ان تیرہ ہفت مذاہیر سے وہ ان باطنی آفات سے محفوظ ہو جائیگا جو ہمارے دل پر ہمرجلی کی طرح گراتی ہیں۔

مردون کے ساتھ باطنی مراسلت باہمی گفتگو

جس طرح مردون کے خیالات اور احساس ہمارے دلوں میں منتقل ہوتے

ہیں۔ اسی طرح مردوں کے خیالات اور احساس بھی ہمارے دلوں میں آتے ہیں کیونکہ قالبِ عسری یا حبائی کے چلے جانے سے دل میں کوئی نقص نہیں آتا۔ اور مرے ہوئے کا دل ویسا ہی قائم رہتا ہے۔ دل سے مراد وہ گوشت کا لوتھڑا نہیں ہے جو بائیں جانب متحرک معلوم ہوتا ہے بلکہ دل سے مراد وہ لطیفہ ربانی ہے جو سوچتا اور سمجھتا ہے یعنی مردوں کے سوچنے سمجھنے اور ادراک کرنے کی قوتوں میں مرنے سے کوئی فتور پیدا نہیں ہوتا۔

اگر ہم اس مسئلہ کو بخوبی سمجھنا چاہتے ہیں کہ مردوں کے ساتھ بھی ہماری باطنی مراسلت قائم ہوئی ہے تو پہلے ہمیں اس بات کو یاد رکھ لینا چاہیے کہ جب آدمی مر جاتا ہے تو وہ ہم سے دفعتاً جدا نہیں ہوتا۔ یعنی مردے ایک مدت تک اپنے دوستوں اور احباب سے قطع تعلق نہیں کرتے۔

اگرچہ ہم اس کو ان اپنی ظاہر آنکھوں سے نہیں دیکھتے۔ کیونکہ جو عالم میں وہ مرنے کے بعد ہوتا ہے اس کا مادہ اس قدر لطیف ہے کہ اس پر آفتاب کی شعاع پڑ کر ہم تک نہیں آتیں تاہم وہ مردہ ہمیں اچھی طرح سے مرنے کے کچھ عرصہ بعد تک دیکھتا ہے اور یہ عرصہ جب تک وہ ہم کو دیکھ سکتا ہے تخمیناً کئی سال کا ہوتا ہے۔ یعنی اس وقت تک وہ ہمیں دیکھتا اور ہماری باتیں سنتا رہتا ہے جب تک کہ وہ عالمِ مثال میں رہتا ہے۔ جب وہ اس

عالم سے اوپر چلا جاتا ہے یعنی جب عالم اوداع میں پہنچتا ہے۔
تو یہ تعلقات قطع ہو جاتے ہیں۔ مگر مرنے کے بعد وہ ایک زمانہ
تک ہمارے رنج و خوشی اور ہیبت و می اور تباہی سے دلچسپی رکھتا
ہے۔ اور ہمارا شریک حال رہتا ہے۔ جیسا کہ وہ مرنے کے پہلے
رہ چکا ہے۔

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ ہم رات کو ہر روز جبکہ ہم سو
جاتے ہیں اپنے مرے ہوئے دوستوں سے اسی طرح تبادُلہ خیالات
کرتے ہیں جیسے کہ ہم حالت زندگی میں ان سے کیا کرتے تھے۔
بلکہ جاگنے کی حالت میں بھی ہمارے محبت آمیز خیالات ان تک
پہنچتے ہیں اور ان کے خیالات اور احساس ہمارے دلون تک آتے
ہیں۔ جیسے کہ ہمارے پڑوسیوں اور گھر والوں کے خیالات ہمارے
دل میں منتقل ہوتے ہیں ویسے ہی مردوں کے خیالات اور احساس
بھی ہمارے دلون میں آیا کرتے ہیں۔ اسی طرح اکثر خیالات
عالم مثال سے ہمارے دلون میں پہنچتے رہتے ہیں اور وہ ان کے
لوگوں سے باطنی مراسلت اور گفتگو قائم ہے۔ مگر ہم اس سچی بات سے
محض ناواقف ہیں۔

الہام و اردات اور القا

بعض اوقات ایک پرورش مقرر ایک طلبہ میں تقریر کرتا ہے جہاں بہتر

گوش سامعین جمع ہوتے ہیں۔ اور اپنی جادو بیانی سے اہل مجلس پر اثر ڈالنے کی سخت کوشش کرتا ہے۔ اس وقت اس کا یہ دلی جوش و خروش کبھی کبھی ایک نہایت ہی لائق شخص کے خیالات کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے جو ایک گوشہ بین بیٹھا ہو اسی مصنون کو سوچ رہا ہے جبکہ یہ مقرر اس وقت مجمع میں بیان کر رہا ہے۔ مگر مقرر کی بہ نسبت اس لائق شخص کا مقام اعلیٰ ہے اور وہ اس وقت مثلاً عالم روح میں کام کر رہا ہے اور یہ مقرر عالم ناسوت میں تقریر دے رہا ہے اس لئے اس لائق شخص کے خیالات اور احساس بوجہ کشش جذب کے مقرر کے دماغ میں آنے لگے ہیں اور وہ اس وقت اپنی تقریر میں ایسے ایسے نکات اور مضامین بیان کر رہا ہے۔ جو اسکی استعداد اور قابلیت سے باہر ہے اور جنہیں سامعین کے کانوں نے کبھی نہیں سنا۔ اس وقت مقرر کی زبان سے وہ وہ فصیح الفاظ اور جملے نکل رہے ہیں جن کے سننے سے لوگوں کو حیرت اور تعجب ہے ایسے موقع پر کہا جاتا ہے کہ یہ الہامی تقریر ہے۔ مگر لوگ اس کی اصلی وجہ کو نہیں جانتے۔ تھوڑی دیر کے لئے اسکا دماغ ایک فونو گراف کا آلہ ہو گیا ہے اور اس لائق شخص کے پر زور خیالات اس کے ذریعہ سے ظاہر ہو رہے ہیں جو عالم روح میں اس وقت کام کر رہا ہے۔ اس موقع پر ایک اور روایت کا ذکر نامناسب نہ ہوگا۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک دفعہ کوئی داعط ایک مجلس میں وعظ کر رہا تھا۔ اور اس کے

بیان اور مضمون پر لوگ عیش عیش کر رہے تھے۔ وہاں ایک نامی گرامی
 مرشد یا پیر بھی موجود تھے۔ ان کے کسی مرید نے حضرت کے کان
 میں کہا کہ واعظ اپنی استعداد اور لیاقت سے زیادہ اس وقت نکات
 بیان کر رہا ہے۔ پیر نے کہا کہ یہ مال اس کا نہیں ہے کسی دوسرے
 کا ہے۔ مگر اس کی زبان سے صاحب مال کا فیض جاری ہو رہا ہے۔
 اور وہ شخص اسی مجلس میں موجود ہے۔ مرید نے تعجب سے کہا کہ اسکا
 ثبوت کیا ہے۔ مرشد نے کہا کہ لوا بھی اس کا فیضان بند ہوا جاتا ہے
 پھر تم دیکھنا کہ اس کی زبان سے یہ باتیں نہ نکلیں گی۔ یہ کہہ کر مرشد نے
 ہتھوڑا سکوت کیا اور واعظ کی ساری فصاحت و بلاغت ایک دم سے
 روانہ ہو گئی۔ اب نہ وہ عالی مضامین ہیں اور نہ وہ فصیح الفاظ۔ لاکھ
 لاکھ کوشش کرتا ہے۔ مگر ایک جملہ بھی پہلے کی طرح سے نہیں نکلتا
 آخر کار واعظ منبر سے نیچے اتر آیا۔ اور مرشد نے اپنی مرید سے کہا کہ
 اس وقت اس واعظ کے جوش نے اس عالی خیال شخص کو متوجہ
 کر لیا تھا جو عالم ارواح میں کام کر رہا تھا۔ اور یہ قیمتی خیالات اور فصیح
 الفاظ اسی کا مال تھے۔ اب اس کی توجہ واعظ کی طرف سے اٹھ
 گئی۔ اور واعظ کی اس قدر استعداد نہیں ہو خود ایسے خیالات
 پیدا کرے۔

جب کسی مقرر کا جوش و خروش اثنائے تقریر میں کسی عالی خیال
 شخص کے خیالات کو کشش جذب سے کہنیچتا ہے تو اس وقت

دفعاً اسکے دل میں خیالات اعلیٰ آنے لگتے ہیں جنہیں وہ فصیح اور بلیغ الفاظ اور جملوں میں نذر ناظرین کرتا ہے اور سامعین اس کی فصاحت و بلاغت پر عیش عیش کرتے ہیں اور اس کے عالی خیالات اور سحریائی کی داد دیتے ہیں۔

درحقیقت یہ خیالات الہام اور واردات کہے جاسکتے ہیں۔ جو عالم ارواح سے اثر کر مقرر کے دماغ کے ذریعہ سے ظاہر ہوتے ہیں خواہ وہ خیالات عالی کسی زندہ کے ہوں یا مردہ کے۔ بہر حال یہ ایک قسم کا الہام واردات اور القا ضرور ہے۔

خود بخود لکھا جانا اور تصویر کھینچنا

ارواح ہمارے دماغوں میں صرف خیالات ہی نہیں ڈالتیں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ کبھی ان کا ظہور ہو جاتا ہے۔ وہ کسی کے ہاتھ پر بھی قبضہ کر سکتی ہیں اور جو چاہیں اسکے ہاتھ سے لکھوا اور کھینچوا سکتی ہیں۔ اور یہ عمل دماغ کے ان مرکوزوں کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے جو عالم مثال سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسکو خود بخود لکھے جانا کہتے ہیں۔ اور روحانی اشخاص کے دائرہ میں ایسے واقعات معمولی شمار کئے جاتے ہیں اور عوام الناس بھی اکثر ایسے واقعات مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ جب کوئی روح کسی شخص کے ہاتھ پر قابض اور مستغرق ہوتی ہے تو ہاتھ اصلی شخص کے اختیار میں نہیں ہوتا اور وہ شخص جبہ روح آتی ہے یہ نہیں

جانتا کہ میں کیا لکھ رہا ہوں اور کیا کھینچ رہا ہوں۔ جو کچھ وہ روح چاہتی ہے اس کے ہاتھ کے ذریعہ سے لکھتی اور کھینچتی ہے۔ مگر شخص مذکور کو اس کی مطلق خبر نہیں۔

ہمارے ناظرین نے اکثر سنا ہوگا کہ جب کسی پر سایہ ہو جاتا ہے۔ یعنی روح اس پر قبضہ کرتی ہے۔ تو مقبوض اجنبی زبانیں بولنے لگتا ہے حالانکہ وہ ان زبانوں سے واقف بھی نہ تھا اور جب سایہ چلا جاتا ہے تو زبان اجنبی نہیں بول سکتا اس زمانہ میں علم روحانی کی عدم واقفیت سے لوگ سایہ اور تصرف ارواح سے انکار کریں۔ مگر انکے اس انکار اور جہل سے واقعات باطل نہیں ہو سکتے۔ ہم نے خود اکثر لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ یہ سب دہمی اور خیالی باتیں ہیں۔ مگر انہیں یہ معلوم نہیں کہ وہ خود علم باطن اور اصول روحانیت سے ناواقف ہیں۔

سائہ والے کی باتیں

بسطح ایک روح کسی شخص کے ہاتھ پر قابض اور متصرف ہوتی ہے اسی طرح وہ اور اعضا پر بھی قبضہ کر سکتی ہے بعض اوقات ایک روح اپنے وجود مثالی کے ساتھ ایک شخص کے گلے اور زبان پر متصرف ہوتی ہے اور اس کے اعضا سے آواز سے کام لیتی ہے اور اس ذریعہ سے اسکو آدمیوں سے باتیں کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اور حاضرین سے جو جی میں آتا ہے کہتی ہے جبکہ کوئی روح صرف گلے

اور زبان ہی پر قبضہ کرتی ہے۔ تو معمول یا وہ شخص جس پر وہ روح آتی ہے اپنی باتوں کو تو سنتا اور جانتا ہے مگر اسکو اپنے حلق اور زبان پر کوئی قابو نہیں رہتا اور وہ اپنی زبان کو باقیں کرنے سے نہیں روک سکتا۔

مگر جب کوئی روح کسی شخص کے پورے جسم پر قابض اور مقصرت ہو جاتی ہے۔ تو اس وقت اسکو ہوش نہیں رہتا اور وہ اپنے افعال و حرکات سے بالکل ناواقف ہوتا ہے۔ اور جب روح اس کے جسم سے چلی جاتی ہے اور اسکو ہوش آتا ہے۔ تو اپنے حرکات اور افعال اسکو مطلق یاد نہیں رہتے۔ جو کچھ حالات اس بے ہوشی میں گزرتے ہیں ان سب کو بھول جاتا ہے۔ نہ اسکو اپنی باتیں یاد رہتی ہیں اور نہ دوسروں کی روح کے آنے سے معمول کے چہرے پر تغیر ہو جاتا ہو۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ دلی حالت کے بدلنے سے چہرے کی حالت بھی بدل جاتی ہے۔ غصہ۔ رنج اور خوشی کی حالتوں میں چہرے کی مختلف حالتیں ہوتی ہیں جن سے سب واقف ہیں۔ زیادہ بیان کی حاجت نہیں اسی طرح جب کوئی روح کسی شخص کے جسم پر پورا قبضہ کرتی ہے تو اس کے چہرے ہرے بلکہ تمام جسم کی حالت میں تغیر پیدا ہو جاتا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ جسم اس روح کی حالت کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے سر پر آئی ہے۔ جن بیہوش اور ارواح کے ساء کے مثالیں اس کثرت سے

ہمارے ملکوں میں واقع ہوتی ہیں جن کو ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ زیادہ توضیح اور ثبوت کی یہاں ضرورت نہیں۔ مثلاً یہ سے زیادہ کوئی دلیل عقلی زوردار نہیں۔ صرف اتنا کہہ دینا کافی نہیں کہ یہ حالات وہی اور خیالی ہیں۔ جبکہ ہزاروں واقعات روحانی اثرات پر گواہی دے رہے ہیں اور اس بات کا یقین دلانے میں کہ ارواح زندہ اجسام پر متصف ہوتی ہیں۔ تو اب ان حالات سے انکار کرنا محض عدم علم و فہم کی بنا پر ہے۔ عالم ارواح کے حالات سے وہی اشخاص انکار کر بیٹھے ہیں جو علم باطن سے محض گورے ہیں۔

روح کا مادی شکل اختیار کرنا

انسان پر قبضہ کرنے کے علاوہ روح مادی شکل بھی اختیار کر سکتی ہے اور ان تدبیروں سے وہ عالم اجسام سے تعلق پیدا کر لیتی ہے۔ اور لوگوں سے گفت و شنید کرتی ہے عالم مثال کی روح کسی زندہ شخص کے اطراف سے ایتھریل مادے کو لیکر کوئی عضو انسانی بنا سکتی ہے اور اس بنانے کے کسی طریقے میں جو اس وقت بیان نہیں کئے جاسکتے۔ یہ روح اس مادے سے ہاتھ بنا کر اس کے ذریعہ سے عالم اجسام کی کسی شے کو حرکت دے سکتی ہے یا اس مادے کو اپنے مثالی ہاتھ پر لپیٹ کر اور اس کو جسمانی بنا کر دکھا سکتی ہے۔ بعض اوقات روح اس ایتھریل مادے کو اپنے وجود مثالی پر

خوب چڑھا کر اور ایک مجسم آدمی بنکر ہمارے سامنے آتی ہے اور ہم سے
 باتیں چیتیں کرتی ہے۔ اسی کارروائی کو ہم روح کا مادی شکل اختیار
 کرنا کہتے ہیں۔ اس لطیف جسم کے ساتھ وہ دنیا میں بہت سے تماشے
 دکھاتی ہے اور اپنی دلی خواہشوں کو پورا کرتی ہے۔

عالم اجسام کی اشیا کو کوئی قوت بغیر مادے کے توسل کے
 حرکت نہیں دے سکتی۔ جب آدمی مر جاتا ہے اور اس کا قالب عسری
 باقی نہیں رہتا۔ تو وہ اپنے وجود مثالی سے کسی چیز کو حرکت نہیں
 دے سکتا۔ مگر وہ دوسرے شخص کے اندر داخل ہونے یا اپنے اوپر
 ایہ ترل مادے کی موٹی تہ چڑھانے سے وہ البتہ اس عالم کی چیزوں
 سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

ان دونوں تدبیروں سے وہ ہماری دنیا کی اشیا پر تصرف ہو سکتا
 ہے اور جو جی چاہے وہ نتیجہ پیدا کر سکتا ہے مگر بغیر اس مادے کی
 مدد کے کوئی روح اجسام میں تصرف نہیں کر سکتی۔

لیکن یہ ضرور نہیں کہ ہر حال میں وہ مادی شکل دنیا داروں کو دکھائی
 بھی دے جسکو روح نے اختیار کیا ہے۔ اگرچہ کہ بعض اشکال سخت
 مادے کے ہوتے ہیں۔ مگر اکثر اشخاص کو وہ دکھائی نہیں دیتیں۔

بعض اوقات لوگوں کو ارواح ایک دھوئیں یا ابر کی شکل میں اٹھتی
 ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ بعض مرتبہ مجسم آدمیوں کی طرح دکھائی دیتی
 ہیں۔ اور ان کے اجسام کو چھو سکتے ہیں۔ مگر اس میں کوئی شک و شبہ

ہنہیں کہ جب تک کوئی روح ثقیل مادے سے اپنا جسم ہنہیں بناتی تب تک وہ مادی چیزوں کو حرکت ہنہیں دے سکتی۔

مرنے کے بعد انسان اس دنیا کی چیزوں کو اسی طرح دیکھتا ہے جس طرح کہ وہ زندگی میں دیکھتا تھا۔ اس وقت اس کا جسم کثیف ہنہیں ہوتا۔ مگر جسم لطیف یا قالب مثالی ہوتا ہے اسلئے جب وہ اپنے اس قالب مثالی پر ایتھریل مادہ کی موٹی تہ چڑھا لیتا ہے تو وہ نظر آنے لگتا ہے۔ کیونکہ شعاع آفتاب ثقیل مادے پر گر کر روشنی میں اور اس لئے اشیاء کھائی دیتی ہیں۔

اس وقت وہ مرا ہوا آدمی اپنی پوری شکل و صورت میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ عالم مثال کی ایک روح کو یہ بات بہت آسان ہے کہ وہ کسی شخص کی صورت اختیار کر لے۔ اسلئے دل میں قوی تصور کرتے ہی اس کی صورت آدمی کی ہو جاتی ہے جسکی شکل میں وہ ظاہر ہونا چاہتا ہے۔ کیونکہ عالم مثال کا مادہ بہت لطیف ہے وہ آسانی سے ہر سانچے میں ڈھل سکتا ہے اور اس لئے ایک عالم مثال کی روح ہر شکل و صورت کو آن واحد میں بدلتی ہے۔

یورپ اور امریکہ میں آج کل لوگ بڑے بڑے اشخاص مثلاً سقراط افلاطون وغیرہ کی ارواح کو بلا تے ہیں اور عوام الناس سے باتیں کراتے ہیں اور لوگ انہیں وہی سمجھتے ہیں جو ان سے کہا جاتا ہے۔ یہ کارروائی صرف ایک دھوکے کی مٹی ہے وہی ایک روح مختلف اشکال میں کھائی دیتی ہے اور باتیں کرتی ہے اور نہ سقراط کی روح آتی ہے اور نہ افلاطون کی۔ اہل فہم اور علوم باطن کے اسرار جاننے والے ایسے تماشوں اور شعبہ

یازیدون کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

خود بخود سلیٹ پر لکھ جانا

سلیٹ پر خود بخود لکھ جانا بھی ان حالتوں میں داخل ہے جبکہ روح لطیف مادے کی نہ اپنے اوپر چڑھاتی اور اس دنیا کی اشیاء کو حرکت دیتی ہے۔ جب کسی قابل شخص کو یہ منظور ہوتا ہے کہ روح کچھ سلیٹ پر لکھے اور لوگ اس تحریر کو دیکھیں۔ تو وہ سلیٹوں کے بیچ مین پینل کا ایک ٹکڑا رکھ دیتا ہے اور انہیں کپڑے میں اچھی طرح لپیٹ کر اسپر مہر لگا دیتا ہے تاکہ لوگوں کو یہ شبہ پیدا نہ ہو کہ کسی خاص تدبیر سے تحریر حاصل کی گئی ہے اس کا ردوائی کے بعد غیر مری دنیا یا عالم مثال کی ایک روح جسکو لکھنا آتا ہے اور جو اس وقت لکھنا چاہتی ہے اپنے مثالی ہاتھ پر ایہ تہریل مادے کی ایک تہ چڑھالیتی ہے جو سلیٹوں کے اطراف و جوانب بکثرت بکھرا ہوا ہے اور اس ترکیب سے وہ اس پینل کو اپنے مادی ہاتھ سے حرکت دیتی اور لکھتی ہے۔ ثقیل سے ثقیل مادے میں بھی ایہ تغیر بغیر کسی مزاحمت اور مخالفت کے داخل ہوتا ہے۔ اسلئے ایک ایہ تہ کا تھ سلیٹ میں سو اس طرح باسانی نگھس جاتا ہے جیسو کہ وہ زمین یا وہاں میں سو ہار ثقیل ہاتھ بغیر کسی مزاحمت اور وقت کے گزر جاتا ہے ان تجربوں سے ثابت ہے کہ روح اس عالم ناسوت کے ساتھ ایہ تہ کے ذریعہ سے تعلق پیدا کر سکتی ہے

سالک کا طریقہ

ایک تربیت یافتہ سالک اس عالم ناسوت سے انتقال کے بعد یازندگی ہی

مین عالم آخرت یا غیر مری اور وسیع عالم مین کام کرتا ہے اور بعض اوقات اس کو کسی شخص کی اعانت اور امداد کی ضرورت داعی ہوتی ہے۔ جو کسی تکلیف یا عذاب مین ہوتا ہو تو ایسی صورت مین وہ اپنے وجود مثالی کے اطراف فضا مین سے ایتریل مادہ لپیٹ لیتا ہے اور اس تدبیر سے اس کا وجود مثالی مادی شکل حاصل کرتا ہے وہ نہ تو کسی شخص کے اندر گھس کر کوئی کام اس دنیا مین کرتا ہے اور نہ کسی کے اطراف و جوانب سے اسکے ایتریل مادے کا کوئی حصہ لیتا ہے بلکہ اس کثیر مادے مین سے جو عالم مین ہر جگہ بھرا ہوا ہے وہ لے لیتا ہے اور اسکو کام مین لاتا ہے۔ اور اس مادے سے جو شکل چاہتا ہے اسکو اختیار کر کے اس شخص سے باتیں کرتا اور اسکو مدد دیتا ہے جو تکلیف یا عذاب مین مبتلا ہے۔ اور جب وہ اس شخص کی امداد کر چکتا ہے تو پھر اس قالب لطیف کو چھوڑ دیتا ہے اور پھر یہ جزوی مادہ اپنے کل مین مل جاتا ہے اور اپنی اصلی صورت پر عود کرتا ہے۔ اور سالک کی روح پھر اپنے کام مین مصروف ہو جاتی ہے۔

فصل ۴ - معمول

جسمانی خصوصیت

معمول یا وہ شخص جس پر کوئی روحانی اثر ڈالا جاتا ہے یا کسی روح کا قبضہ پھر

باسانی ہوتا ہے ایک ایسا شخص ہوتا ہے جس میں معمول ہونے کی جسمانی قابلیت یا خصوصیت ہوتی ہے۔ اس کے اجزاء جسمانی اور اجزاء مثالی میں چسپیدگی کم ہوتی ہے اور اس کا قالب مثالی آسانی کے ساتھ جسمانی قالب سے جدا ہو سکتا ہے۔ معمول ہونے کی قابلیت اگرچہ خلقی ہے۔ مگر وہ عموماً مشق اور کتاب سے بھی حاصل ہوتی ہے۔ جس شخص میں معمول ہونے کی قابلیت ہوتی ہے وہ عام اشخاص سے عقل اور فراست میں کچھ زیادہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے خلاف دیکھا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں اکثر معمول وہی اشخاص دیکھے جاتے ہیں جن کے عقلی قوانین ترقی کم پائی جاتی ہے۔ اگرچہ بعض مستثنیٰ صورتیں بھی موجود ہیں۔

الغرض معمول ہونے کی خصوصیت صرف جسم ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ جب جسم کی ایک خاص حالت پیدا ہو جاتی ہے تو آدمی معمول ہو جاتا ہے۔ معمول کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس کے قواعد و داعی ترقی یافتہ ہوں یا اس کے اخلاق اعلیٰ درجہ کے مہذب ہوں بلکہ معمول میں ان قواعد روحانی اور عقلی کے نمونہ کی تحریک بھی لازمی نہیں۔ اکثر معمول میں قواعد روحانی کی ترقی اور نمونہ بھی پایا نہیں جاتا جو انسان کا اعلیٰ اور افضل پہلو ہے۔ اور درحقیقت انسان اسی پہلو یا رخ کو کہتے ہیں۔

اس پر بھی لوگ معمول ہونے کو ایک روحانی ترقی خیال کرتے ہیں۔

جو شخص صرف ارواح کا اعتقاد رکھتا ہے اور بعد الموت زندگی کو
یقینی جانتا ہے اسکو بھی اکثر لوگ ایک روحانی آدمی سمجھتے ہیں اور جو شخص
صوفیوں کی وضع و قطع تراشتا ہے۔ اسکو خدا رسیدہ شخص جانتے
ہیں اور جو شخص صرف عالم مثال کے کھیل تماشوں ہی میں مصروف
رہتا ہے اسکو ایک ربانی شخص یا انسان کامل یا مہاتما خیال کرتے
ہیں مگر سچی روحانی زندگی اور اصلی خدا پرستی چیز ہے دیگر ہے۔

ٹیلیگرام یا عالم مثال کی تار برقیان اور پیغام

عالم مثال سے جو تار برقیان اور پیغام ایک معمول کے توسط سے آتی
ہیں انہیں اگر کوئی شخص حقیقت مذہب سمجھے اور ان پیغاموں کو انکشاف
سمجھ کر معمول کے آگے سر جھکانے اور اسکو ایک مہاتما اور انسان
کامل بادر کرے تو اس کی مثال ایسی ہے کہ گویا وہ الہ آباد کی صدر
اسٹیشن پر جو تار کی بیڑی رکھی ہے اس کو سجدہ کر رہا ہے جہاں سے
تمام ہندوستان کے شہروں کو تار جاتے اور آتے ہیں تار برقی کے
آلہ کی پرستش کرتا اور اسکو مرشد کامل جاننا ایک نادانی ہے۔ دونوں
صورتوں میں پیغام بھیجتے والا شخص ایک ہی ہے خواہ وہ تار اور
بیڑی کے ذریعہ سے پیغام بھیجے یا کسی معمول کے زندہ جسم کے
وسیہ سے۔

اگر کوئی ایسی روح جو جسم ثقیل نہ رکھتی ہو کسی دوسرے آدمی کو

اپنا معمول یا ذریعہ بنا سے یا کوئی ٹیلیفون کو استعمال کرے تو دونوں صورتیں دراصل ایک ہی ہیں اور ان دونوں صورتوں میں روحانیت پائی نہیں جاتی۔ مرنے کے بعد جو ہم ایک مردہ کو روح کہتے ہیں جس نے اپنے جسم کثیف کو اتار ڈالا ہے۔ تو اس سے بہت کچھ اشتباہ اور احتمال پیدا ہو گئے ہیں اور ایک بے ضروری تعظیم اور عزت مردوں کو حاصل ہو گئی ہے۔ حالانکہ مردہ اور زندہ میں صرف جسم کا فرق ہے۔ مرنے میں قالب ثقیل یا جسمانی موجود نہیں اور زندہ میں یہ جسم قائم ہے ہم مردے سے باین اعتبار افضل ہیں کہ ہمارے پاس پورے قالب یعنی ہفت اندام موجود ہیں اور ہم اس عالم مادی کی اشیاء میں تصرف کر سکتے ہیں۔ مگر یہ بات مردے کو نصیب نہیں۔ کیونکہ موت ہم سے صرف اس جسمانی قالب کو چھین لیتی ہے اور ہم روح میں موت سے کوئی تغیر نہیں پاتے۔

ایک گنوار اور جاہل آدمی مرنے کے بعد بھی گنوار اور جاہل رہتا ہے۔ وہ مرنے سے کوئی شاید آدمی نہیں ہو جاتا۔ اگرچہ کہ اس جاہل آدمی کی روح کسی معمول کے ذریعہ سے ذرا اپنے آپ کو لایق اور شاید ظاہر کرے۔ تاہم ہمیں ضرور نہیں کہ ہم اس کے بیان کو اس سے زیادہ وقعت دیں جبکہ وہ حالت زندگی میں ہم سے باتیں کرتا تھا۔

ہم خواہ مخواہ مردوں سے غیر ضروری خوف اور رجا رکھتے ہیں۔

اور ان سے طرح طرح کی مرادیں اور منتیں مانگتے ہیں جبکہ وہ حالت زندگی میں کسی مراد کے بر لانے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ تو مرے کے بعد یہ طاقت انہیں کہاں سے آجائے گی۔ جب کوئی معمول کوئی بات بیان کرے تو ہمیں اس بیان کو اسی حیثیت سے خیال کرنا چاہیو جیسے کہ ایک معمولی آدمی کسی دوسرے معمولی آدمی سے باتیں کر رہا ہے اور اس کا بیان اسکی لیاقت کے موافق اعتبار کیا جاسکتا ہے۔

مقدس کنواری لڑکیاں

کسی شخص کو معمول بنانے یا اس کی وساطت سے کسی روح سے باتیں کرنے یا کوئی کام لینے کا رواج کوئی جدید نہیں بلکہ ہزاروں برس سے یہ طریقہ چلا آتا ہے۔ اور عالم مثال سے تعلق پیدا کرنے کا یہ دزیعہ سب سے زیادہ آسان ہے۔ پرانی کتابوں اور تواریخ کے مطالعہ اور نیز جالکین کے طریقہ تحقیقات سے یہ بات اچھی طرح سے ثابت ہے کہ قدیم ایام سے لوگ کسی شخص کو معمول بنا کے عالم مثال سے مراسلت کیا کرتے تھے۔ جب کوئی باقوت سالک اپنے مراقبہ میں ان قدیم مندروں اور پرتشس گاہوں کو دیکھتا ہے جن کا زمانہ بہت ہی پرانا ہے یا قدیم مصر کے عالیشان عبادت گاہوں یا دیوتاں کے ان مندروں کو جن کے احاطہ سنگ مرمر کی دیواروں سے بنائے گئے تھے اپنی باطنی نظر کے سامنے لاتا ہے۔ تو اس کو دکھائی دیتا ہے

کہ ان مندروں اور عبادت گاہوں کے سامنے ہزاروں پجاریوں اور تیرتھ کرنے والوں کا ہجوم ہے جن کے چہروں اور نگاہوں پر عزت و تعظیم کے آثار نمایاں ہیں اور ان کے بیچ میں کچھ باکرہ کنواری لڑکیاں موجود ہیں جن کے ذریعہ سے بڑے بڑے بیرون اور مہاتماؤں کی ارواح باتین کرتی ہیں۔

اس پرانے زمانے کی حالت میں اور اب اس ہمارے نئے دور کی حالت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اُس زمانہ میں بڑے بڑی شریف خاندانوں کی لڑکیاں اس غرض کے لئے عبادت گاہوں میں چڑھائی جاتی تھیں۔ چنانچہ حضرت مریم کا قصہ جو قرآن مجید میں ہے اس بات پر شاہد ہے اور ان کی زبان سے مقدس روحیں اس عالم مادی کو لوگوں سے باتیں کرتی تھیں۔ یہ کنواری لڑکیاں عبادت گاہوں اور خانقاہوں میں بڑی خبرداری اور حفاظت کے ساتھ پالی جاتی تھیں اور ان کے اطراف و جوانب سوائے تقدس اور پاک کی کے اور کوئی چیز موجود نہ تھی ان کی غذاؤں میں بہت بڑی احتیاط کے ساتھ انتخاب کی جاتی اور پکائی جاتی تھیں اور کوئی برا خیال ان کے نزدیک تک آنے نہ پاتا تھا۔ اس احتیاط اور خبرداری کا نتیجہ یہ تھا کہ ان لڑکیوں کی وساطت سے بڑی بڑی مقدس ارواح نہایت ہی اعلیٰ درجہ کی دانائی کے کلمات لوگوں سے کہتی تھیں اور لوگ ان کو سنکر ان سے فائدے اٹھاتے تھے۔ اور اس حفاظت اور احتیاط کی وجہ سے کوئی نقصان ان لڑکیوں کو

نہیں پہنچتا تھا۔ اور دنیا کو بڑے بڑے فائدے حاصل ہوتے تھے۔
 اس طریقے کے علاوہ ایک اور طریقہ عالم ملکوت سے تعلق پیدا کرنے
 کا یہ بھی ہے کہ سالک ہتھوڑی دیر کے لئے اپنی روح کو اس قالبِ عفرے
 علیحدہ کر لیتا ہے اور اس کے قالبِ مین دوسری ارواح جنہیں وہ بلانا
 چاہتا ہے آجاتی ہیں۔ لیکن یہ طریقہ اسی سالک کو سزاوار ہے جو اعلیٰ درجہ
 کی قوت رکھتا ہے اور جو اپنے ارادے سے اپنے قالب کو چھوڑ کر جب
 تک چاہے علیحدہ رہ سکتا ہے اور اس روح کی باتیں سن سکتا ہے جو اسکو
 اندر داخل ہوئی ہے اور اسکے تمام حرکات کو محسوس کر سکتا ہے۔ جب
 تک کوئی روح اسکے اندر سے باتیں کرتی ہے وہ سالک عالم مثال میں
 علیحدہ کھڑا رہتا ہے اور اسکی باتیں سننا اور عیش عیش کرتا ہے۔
 اس طریقہ میں ان سالکین کے لئے کوئی خوف اور نقصان نہیں ہے

معمول کو خطرات

اس زمانہ میں جو طریقہ معمول بنانے کا اختیار کیا گیا ہے وہ خوف و خطر
 سے خالی نہیں۔ معمول کو اس میں کئی طرح کے نقصان کا اندیشہ ہے۔
 اور اس مصیبت سے اہل باطن اکثر لوگوں کو آگاہ کرتے ہیں۔ مگر کم اشخاص
 اس نصیحت کو گوش دل سے سنتے ہیں۔ جب کسی شخص کو معمول بنایا جاتا
 ہے۔ تو اسکی حالت عموماً بلحاظ تندرستی اور قواس عقلی کے اچھی نہیں رہتی
 یعنی اسکی صحت اور دماغ دونوں پر معمول بننے سے بڑا اثر پڑتا ہے۔ اسکو

علاوہ معمول میں یہ قوت موجود نہیں ہوتی کہ وہ اپنے اختیار سے جس روح کو چاہے اپنے جسم میں آنے دے اور جسکو چاہے نہ آنے دے۔ وہ انتخابِ ارواح میں جو اس پر قبضہ کرتی ہیں بالکل بے بس ہوتا ہے۔ جب کسی معمول کی روح اس کے جسم سے علیحدہ کر دی جاتی ہے تو وہ عالم مثال میں بے حس و حرکت ہوتی ہے اور اکثر اوقات تو اسکو اپنا بھی ہوش نہیں رہتا۔ چہ جائیکہ وہ عالم مثال کی اشیاء کو محسوس کرے۔ اسکی روح اس قدر ناز و بیت یافتہ ہوتی ہے کہ اسکو اپنی اور نہ کسی دوسرے کی آگاہی ہوتی ہے اور وہ اس غیر مرئی عالم میں اپنے ہی خیال میں ڈوبی ہوئی ادھر ادھرستانہ وار ٹھوکرین کہاتی پھرتی ہے۔

ادھر تو اس معمول کی روح اس خراب حالت میں ہوتی ہے اور ادھر کوئی اچھی یا بُری روح اس کے جسم پر قبضہ کر لیتی ہے اور حاضرینِ جلیہ سے اس کے زبان کے توسط سے باتیں کرتی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ کسی نیک آدمی کی روح اس معمول کی امداد اور رہنمائی کرتی ہے اور اسکو قابض روح کی مضرت سے بچاتی ہے۔ مگر یہ رہنما روحیں بھی معمولی اشخاص کی ہوتی ہیں۔ اسلئے ان میں بھی نہ تو کوئی بڑی دانائی اور عقلمندی پائی جاتی ہے اور نہ کوئی غیر معمولی زور و قوت۔

ہم اس بات کو کہیں آگے بیان کر چکے ہیں کہ عالم مثال کے وہ طبقات جو دنیا کے متصل ہیں اکثر ارواحِ خبیثہ اور بدکار آدمیوں کے وجود مثالی سے بھرے ہوئے ہیں اور وہ ان ہر قسم کے بدکار اور ناقص العقل اشخاص مرنے

کے بعد رہتے ہیں۔ معمول کی روح بھی اپنے وجود مثالی کے ساتھ انہیں طبقات میں پہنچتی ہے اور اسکے خالی جسم پر کسی بد معاش کی روح متصرف ہو جاتی ہے یا جو دیکہ محافظ موصین اس ادخال سے اس کے جسم کو بچاتی ہیں۔ مگر پھر بھی ان کا زور ان بدکار پر جو شش اور اہل نفس کی ارواح پر نہیں چلتا اور وہ معمول کے جسم پر پورا قبضہ حاصل کر لیتی ہیں۔ واقعی اس خراب روح کے داخل ہو جانے سے معمول کا قالب جسمانی خراب ہو جاتا ہے اور اسکی نجاست اور بدکاری بھی اس میں اثر کر جاتی ہے اور وہ خبیث روح اس میں جو کچھ بُرا نصرت کرتا چاہتی ہے وہ کرتی ہے اور خواہشات کے پورا کرنے میں کوئی کمی نہیں کرتی۔

اگرچہ اس معمول کے خالی جسم میں کسی معمولی شخص کی روح ہی داخل ہو جائے اور وہ کوئی بدکار اور بد معاش آدمی نہ ہو تو بھی معمول کا قالب عنصری خراب اور نجس ہو جاتا ہے کیونکہ عموماً لوگوں میں خود غرضی اور خواہشات نفس اور غصہ پایا جاتا ہے اور مرنے کے بعد بھی معمولی اشخاص کی ارواح میں یہ بُری خصلتیں باقی رہتی ہیں۔ اور ان ارواح کے داخل ہونے سے کچھ نہ کچھ بُرا اثر معمول کو ضرور پہنچ جاتا ہے

ناپاک اطراف و جوانب

اکثر عوام الناس کے جلسے ناپاکی اور کثافت سے مملو ہوتے ہیں

کیونکہ ان مجنون میں عموماً وہی لوگ موجود ہوتے ہیں۔ جنکے دلون میں خود غرضی اور دیگر جذبات نفسانی کی مختلف کثافتیں بھری ہوئی ہوتی ہیں یہ لوگ اہل باطن کے پاس یا تو اس غرض سے جاتے ہیں کہ ایک عجیب و غریب بات کو دریافت کریں یا محض دینوی مقاصد میں ان سے اعانت طلب کیجائے۔ غرضکہ محض خدا طلبی کے لئے بزرگان دین کے پاس بہت ہی کم لوگ جاتے ہیں۔

چونکہ یہ لوگ موانع شرعی سے پرہیز نہیں کرتے اور حلال و حرام میں انہیں تمیز نہیں ہوتی اور عموماً وہ سببندی شراب کے عادی ہوتے ہیں اور بکثرت گوشت کھاتے ہیں اور اپنے اجسام کو بھی ظاہر اور پاک و صاف نہیں رکھتے۔ اس لئے ان کے جسموں سے بڑی اثرات باہر نکل کر موری کی بدبو کی طرح چاروں طرف پھیلتے ہیں۔ اور اپنی اطراف و جوارب غلاطت و کثافت کا ایک کرہ پیدا کر دیتے ہیں جس سے ہر ایک جاندار متاثر ہوتا ہے اس ہمارے دور میں جبکہ عدم علم روحانیت یا جاہلیت کا دور کہا جاسکتا ہے ایسے پرہیزگار شخص کم موجود ہونگے جو معمول بننے کی پوری قابلیت رکھتے ہوں۔ کیونکہ جو معمول شراب اور گوشت کے عادی ہیں انکے اجسام سے ایسی بڑی گیسیں اور کثیف ہوائیں چاروں طرف پھیلتی ہیں کہ کوئی مقدس روح ان کے پاس تک آنا گوارا نہیں کر سکتی۔ ہاں البتہ کثیف ارواح انکے اجسام میں داخل ہوتی ہیں جنہیں وہ اپنی کم فہمی سے مقدس ارواح خیال کرتے

کرتے ہیں۔ جو لوگ دنیا میں پرہیز گاری کو اپنا شعار نہیں بناتے ہیں ان کے اجسام کی مثال ایسی ہے کہ کوئی غلیظ اور کثیف کپڑے پہن لے یا ایک ایسے نجس مکان میں رہے جو اینٹ اور چونے کی عوض نجاست اور غلاظت سے تیار کیا گیا ہو۔

بھی اسباب ہیں کہ یورپ اور امریکہ میں بعض لوگ ارواح مقدسے باتیں کرانے کے مدعی ہوتے ہیں اور انہیں اپنے دعویٰ میں کامیابی نہیں ہوتی۔ غیر مری عالم کی ارواح مقدسہ عوام الناس کے مجمع میں آنے سے قطعی نفرت رکھتی ہیں۔ گو ان جلسوں میں ان کے قریبی رشتہ دار ہی کیونکہ موجود ہوں۔ کیونکہ عوام الناس کے مجمع کے اطراف و جانب ناپاک اور متعفن کرہ ہوا گھرا ہوتا ہے اور ان سے ان کی طبیعتوں میں سخت انقباض اور تنفر پیدا ہوتا ہے۔ ایسے جلسوں میں سقراط و بقراط اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ارواح مقدسہ تو ہرگز نہیں آتیں۔ مگر صرف معمولی آدمیوں کی روحیں جو اس ناپاک اور کثیف ہوا میں رہنے کی عادی ہیں اور جنہیں انسان کے معلم بنے ہیں ایک طرح کی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ البتہ ان جلسوں میں حاضر ہو جاتی ہیں اور وہ تھوڑی دیر کے لئے اس مادی و نیاسے تعلق پیدا کرنے کا لطف اٹھاتی ہیں۔ واقعی ان معمولی درجہ کی ارواح کو یہ موقع بہت ہی غنیمت ہوتے ہیں جو بالطبع اس دنیا سے دنی کی طرف ہمیشہ مائل رہتی ہیں۔

مجالس اہل اللہ کی شرائط

اس زمانہ میں حال و حال کی مجالس میں عام طور پر سب کو آنے کی اجازت ہے اور اکثر لوگوں کو حال آتے ہوئے بھی دیکھا جاتا ہے۔ لیکن اگر ان مجالس میں بعض شرائط کی پابندی کی جائے۔ یعنی صرف اہل ذوق ہی جمع ہوں۔ تو البتہ دورانِ سمع میں مقدس ارواح بھی ان مجالس میں آسکتی ہیں اور اہل باطن کو ان کی حاضری سے بہت کچھ فوائد پہنچ سکتے ہیں۔ اگر ان مقدس جلسوں کی شرائط تبدیل کر دی جائیں اور صرف انھیں لوگوں کو ان میں آنے کی اجازت دی جائے۔ جنکی زندگی پاک و صاف اور بے غرضانہ ہو۔ اور جنکے مقاصد زندگانی صرف روحانی ہوں۔ اور اگر صاحب ذوق کوئی ایسا شخص ہو جو پرہیزگار اور متقی ہو اور جس کے خیالات مقدس اور روحانی ہوں اور جس کا دل حرص و حسد اور دیگر لوٹ لٹنسانی سے پاک ہو۔ تو البتہ ان جلسوں سے استفادہ کثیر دنیا کو پہنچ سکتے ہیں جبکہ یقیناً بھی اس زمانہ میں لوگوں کو آہنیں سکتا۔ مسٹر اسٹیڈ نے یورپ میں انھیں شرائط پر ایک خانقاہ قائم کی ہے۔ ہمارے ملک میں بھی انھیں اصولاً کسی زمانہ میں خانقاہ میں بنائی جاتی تھیں اور اب ہمارے عہد سے سالکین یہاں رکھ کر تربیت کئے جاتے تھے ان خانقاہوں کو بیعت الممال سے کافی اعانت بھی دی جاتی تھی۔ چنانچہ اس زمانہ میں بھی صد ہا معافیات اراضی اور زمینیں اور وظائف ان خانقاہوں کے لئے سرکار کی طرف سے دئے جاتے ہیں۔

مگر معلوم نہیں کہ جس غایت کے لئے یہ روپیہ دیا جاتا ہے وہ کہاں تک پوری ہوتی ہے۔ عام طور پر تو صرف سالانہ عرس و عہوم و عہام سے کٹی جاتے ہیں اور روشنی اور مجلس سماع ہی کا رواج پایا جاتا ہے۔ اگر ان خاتقاہوں میں سالکین کی باضابطہ تعلیم و تربیت پر زور دیا جائے اور علم روح کی تحقیقات میں وقت اور روپیہ صرف کیا جائے تو البتہ دنیا کو بہت کچھ فائدے ان سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

اگر ان مجالس کے شرائط بدلے نہ جائیں گے۔ تو نتائج بھی وہی سنیں گے جواب تک رہتے چلے آئے ہیں۔ بے ضابطہ تعلیم و تربیت سے جو شرائط پرہیزگاری اور اتقا کے ساتھ نہ ہو۔ سالک یا معمول اکثر نقصان اٹھاتے اور خراب ہو جاتے ہیں اور آخر کار وہ وہم و خیال کی غلامی کرتے ہیں اور روحانی فضیلت اور کشف و کرامت سے بے نصیب رہتے ہیں۔ اور بعض تو ان میں سے محبتوں اور محبوظ بھی ہو جاتے ہیں جنہیں لوگ مجذوب کہتے ہیں۔ اگر خاتقاہوں کے مشایخ اور مرشد اور رہنمائے سالکین علم روحانی میں کچھ اضافہ کرنا چاہتے ہیں اور اس قیمتی علم کو زندہ رکھنے کے خواستگار ہیں تو انہیں چاہیے کہ علم نقیص کی موجودہ حالت ایک عمیق نظر ڈالیں اور اس کی اصلاح کی طرف کوشش کریں اور انہیں خاتقاہوں میں ایسے مریدوں کو رکھ کر تعلیم و تربیت کریں۔ جن کے اعمال و انعام کی پوری محافظت کی جائے۔ اور دینی و سوسائٹی اور عام لوگوں کی سمجھوتہ سے بالکل بچائے جائیں۔ انہیں اس بات کی کبھی اجازت نہ دی جائے کہ

و خود غرض اور نفس پرست اہل دنیا سے کوئی تعلق رکھیں۔ ایسا لکین اسوقت ہیا ہو سکتے ہیں جب بچپن ہی سے اون کی احتیاط اور حفاظت عمل میں آئے اور وہ دنیا داروں کی سوسائٹی کے اثرات سے محفوظ رکھے جائیں۔

روح کو مادی شکل میں لائیکے خطرات

معمول کے ایتھیریل مادی کے ذریعہ سے کسی روح کو عالم مری یا خلیج میں لانا اور اس روح کو اس تدبیر سے مشکل کر کے لوگوں کو دکھانا کبھی خطرے سے خالی نہیں۔ عام طور پر سالکین کو اس عمل کی ہرگز اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اس سے صرف معمول کی صحت ہی خراب نہیں ہوتی بلکہ اسکی جان کا بھی خطرہ ہے۔ جب کسی معمول کے اطراف سے اس کا ایتھر اس عمل کے لئے لیا جاتا ہے۔ تو اسوقت اسکی جان میں کمی آجاتی ہے اور اس کی واسٹل فورس کم ہو جاتی ہے جس پر مدار زندگی ہے۔ جسقدر کسی شخص کے جسم سے ایتھر کم کیا جائے گا اسی قدر اس کی جسمانی طاقت کم جائیگی اور اس کے بعد سخت غشی اور بے ہوشی کی حالت طاری ہو جائے گی اس حالت میں اعضائے جسمانی میں ایک قسم کی بے ترتیبی واقع ہوتی ہو دل کی حرکت دھیمی پڑ جاتی ہے اور معدہ خراب ہو جاتا ہے۔ الغرض معمول کو اکثر اس عمل کے کرنے سے جسمانی خرابیاں لاحق ہوتی ہیں اور اسکا دماغ اور قلب کمزور ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات ان صورتوں میں معمول کو

شراب یا دیگر محرک خون مشروبات پلائی جاتی ہیں اور پھر رفتہ رفتہ آمین شراب خواری کی عادت پیدا ہو جاتی ہے۔

ایتھیریل ماؤے کا نقصان

جب کوئی روح یا وجود مثالی کسی زندہ آدمی کے ایتھر کو لے کر اپنے اوپر اسکی تہ چڑھاتی ہے اور اس طرح وہ ہمارے سامنے آتی ہے تو معمول کی جان میں نقصان وارد ہوتا ہے۔ اور اس کی قوت زیست کم ہو جاتی اگر وہ روح جس نے قالب ماؤی اختیار کیا ہے ایک پر جوش اور غضب خاصیت رکھتی ہے یا نفسانیت اور خواہشات اس پر غلبہ کئے ہوئے ہیں تو اس کے یہ خصوصیات اس ایتھر کے ذریعہ سے اس معمول پر بھی اثر کر نیگی جس کے جسم سے یہ ایتھر لیا گیا ہے۔ کیونکہ جب وہ روح نظر سے غائب ہو جاتی ہے اور اسکا یہ جدید ایتھیریل جسم ٹوٹ جاتا ہے۔ تو پھر وہ ایتھر اس معمول کے جسم میں آ جاتا ہے اور اسوقت اس ماؤہ میں اس روح کے خصوصیات باقی رہ جاتی ہیں جو اس زندہ کے اندر سرایت کرتی ہیں ان وجوہ پر نظر کرنے سے یہ عمل ہی ہمارے نزدیک کرنے کے لائق نہیں جس سے کسی شخص کو مضرت پہنچے۔

معمول کے علاوہ جس جلسے میں یہ عمل کیا جاتا ہے وہاں کے تمام اشخاص کے جسم میں سے بھی کچھ نہ کچھ حصہ ایتھیریل ماؤہ کا لیا جاتا ہے اور اس طرح معمول کے جسم کی حفاظت کی جاتی ہے۔ الغرض ایسے عملیات سے جو

محض کھیل تماشے کی غرض سے کئے جاتے ہیں ایک گونہ مضرت اور
لفظان سب کو پہنچتا ہے اور لوگ اس راز سر بستہ سے آگاہ نہیں ہوتے

زندہ اشخاص پر ارواح کا مسلط ہونا یا قبضہ کرنا

اگر کوئی شخص جس پر عالم مثال کھلا ہوا ہے ایک ایسے جلسہ پر باطنی
نظر ڈالے جہاں کسی معمول پر کوئی روح بکائی جا رہی ہے تو اس کو صاف
دکھائی دے گا کہ اس جلسہ کے مکان میں ارواح کا اثر و بام یا مجمعہ ہے
کیونکہ اس عمل کی خامیت ہی یہ ہے کہ وہ عالم مثال کی ارواح کو اس مکان
جلسہ کی طرف کھینچ لائے۔ مگر ان ارواح میں سے صرف ایک یا دو حین
معمول کے جسم میں سے ایتھر لے کر حاضرین جلسہ کے سامنے آتی
ہیں اور باقی ناکام رہتی ہیں۔ اور وہ اپنے اثرات خواہ اچھے ہوں
یا بُرے حاضرین مجلس پر ڈالتی ہیں۔ بعض اوقات یہ ارواح حاضرین
میں سے کسی بد قسمت شخص کے اس حجاب یا پروے کو بھاڑ ڈالتی
ہیں جو عالم ناسوت اور عالم مثال کے درمیان واقع ہے اور جس کا ذکر
ہم گزشتہ فصل میں کسی جگہ کر آئے ہیں اور اس پروے کے دور
ہو جانے کے بعد یہ بد قسمت شخص اس روح کے اختیار میں آجاتا ہے
جس نے اس پر یہ تصرف کیا ہے۔ اس وقت یہ روح اگر چاہے تو پھر
ہمیشہ اپنا قبضہ رکھے اور اس کی زندگی کو تلخ کر دے اور یہی دنیا
اس کے لئے و دوزخ ہو جائے۔ اس حالت میں یہ بچارہ شخص کیا کر سکتا ہے

وہ تو بالکل اس روح کے اختیار میں ہوتا ہے۔

جب ایک دفعہ بھی یہ پردہ دور ہو گیا۔ تو اب وہ شخص جس کا پردہ دور ہوا ہے اکثر بُرے ارواح کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور یکے بعد دیگرے اس پر بدکاروں اور بد معاشوں کی روحیں قبضہ کرتی رہتی ہیں۔ اور وہ ان کے ہاتھوں میں ایک گیند یا کٹ پتلی ہوتا ہے۔ جدھر خبیث ارواح اس کو لئے جاتی ہیں اور ہر جاتا ہے اور جیسا ناچ وہ اس کو نچاتی ہیں ویسا ناچتا ہے۔ یہ بات قابل افسوس ہے کہ عالم مثال کے اسفل طبقات میں اکثر بد معاشوں اور نالائق شخصوں کی روحیں پریشان طور پر چکر کاٹتی ہوئی پھرتی ہیں اور وہ ہمیشہ اس تلاش میں رہتی ہیں کہ کسی معمول یا کمزور آدمی میں گھس کر اس مادی دنیا کے لذائذ سے پھر بہرہ ور ہوں ان کو ایسے کمزور اشخاص ایک نعمت غیر مترقبہ ہوتے ہیں۔ اس لئے جس شخص کا یہ فطری حجاب دور ہو جاتا اس کی حالت اچھی نہیں رہتی۔ وہ قابلِ رحم ہو جاتا ہے۔ میں نے خود حیدر آباد ہی میں ایک آدمی کو دیکھا ہے جس پر عالم مثال کا اسفل طبقہ کھلا ہوا ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح یہ اسکی دید بند ہو جائے۔

بعض اشخاص کا بیان ہے کہ یہ شخص پہلے تصوف اور علم آخرت کا قائل نہ تھا اور ایک جلسہ میں اس کے خلاف گفتگو کر رہا تھا اتفاقاً وہاں کوئی صاحبِ دل بھی بیٹھے تھے۔ انھوں نے اپنے تصرف سے

اس کا حجاب دور کر دیا اور اس کو عالم مثال کے اسفل طبقہ نظر آنے لگو۔ اور وہ اس علم مقدس اور آخرت کا قائل تو ہو گیا۔ مگر پھر اسکی نظر عالم مثال غائب نہ ہوا اور یہ بات اس کو ناگوار خاطر ہے۔

اگر حجاب دور بھی نہ ہو۔ اس وقت بھی یہ ہوتا ہے کہ بعض بُری روحیں اور اشخاص کے ساتھ ان کے گھروں کو لگی چلی جاتی ہیں۔ جو ان جلسوں میں حاضر ہوتے ہیں جہاں ارواح کے پھیل تماشو دکھائی جاتے ہیں۔ اور جب کبھی موقع ملتا ہے تو ان کو ستانے میں در بیچ نہیں کرتیں۔ اس موقع پر یہ بات بھی قابل بیان ہے کہ بچوں اور لڑکوں پر بُری ارواح کا جلد اثر پڑتا ہے اور بالغ کی نسبت ان میں متاثر ہونے کی قابلیت زیادہ ہے۔ اس لئے اگر وہ ارواح جو حاضرین جلسہ کے ساتھ لگ آتی ہیں۔ ان کے گھروں میں داخل ہو جائیں جہاں چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ تو البتہ افسوس ناک نتائج پیدا ہو جائیں گے مگر آجکل لوگ ان خرابیوں کو جانتے نہیں۔

ہم یہاں پر لوگوں کو یہ ممانعت نہیں کرتے کہ لوگ اس قسم کے جلسہ نہ کیا کریں۔ بلکہ ہماری رائے یہ ہے کہ یہ جلسے خاص ہونا چاہیئے۔ جہاں مخصوص اشخاص موجود ہوں۔ ان جلسوں کو عام طور پر کرنا اور عوام کو ان میں بلانا خطرے سے خالی نہیں۔ کیونکہ عوام الناس میں اس قدر صلاحیت نہیں کہ وہ بُرے ارواح کے اثرات سے متاثر نہ ہوں اور خواص پر ان بُری ارواح کا زیادہ اثر نہیں پڑ سکتا۔ اسی وجہ سے اگلے

زمانہ میں خاص مٹھلکین ان غلوں کے واسطے کی جاتی تھیں اور معمول بھی خاص خاص حفاظت کے ساتھ رکھے جاتے تھے۔

فصل ۵۔ روح اعلیٰ

تقید دماغ

سلوک کا طریقہ جس سے عالم مثال کھل جاتا ہے کوئی خلاف فطرت بات نہیں ہے۔ اس طریقہ پر عمل کرنے سے روح اعلیٰ اور دماغ کے درمیان ایک راہ پیدا ہو جاتی ہے۔ دماغ خود خیال پیدا نہیں کرتا۔ وہ تو محض ایک آلہ یا فونو گراف کی پلیٹ یا بانسری ہے جس کے ذریعہ سے خیالات ظاہر ہوتے ہیں۔ یعنی خیالات دل میں پیدا ہوتے ہیں اور وہ دماغ میں آکر ظاہر ہوتے ہیں۔ تمام خیالات قلب اعلیٰ یا روح اعلیٰ کی حرکت سے پیدا ہوتے اور دماغ انہیں وصول کرتا ہے یعنی وہ مقام قلب میں پیدا ہونے کے بعد دماغ میں اترتے ہیں اور پھر دماغ کے ذریعہ سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ تمام خیالات اور احساس قلب اعلیٰ کے مقام کی تار برقیان ہیں جنہیں ہمارا دماغ رسیو کرتا یا وصول کرتا ہے۔ مگر بعض خیالات ایک دماغ سے دوسرے دماغ میں بھی منتقل ہوتے ہیں۔ اس صورت میں بھی

خیالات کا سرچشمہ قلب ہے۔ اس جگہ اس بات کے اظہار کی بھی ضرورت ہے کہ بغیر دماغ کی وساطت کے بھی خیالات قائم ہوتے ہیں۔ دماغ خیالات کے لئے کوئی ضروری شے نہیں ہے جیسا کہ آج کل مادیین خیال کرتے ہیں۔ وہ اپنی غلط فہمی سے دماغ ہی کو خیالات کا پیدا کرنے والا جانتے ہیں۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ جب دماغ معطل ہوتا ہے جب بھی انسان کے دل میں خیالات بدستور پیدا ہوتے ہیں۔

اس بات کے سننے سے لوگوں کو کس قدر حیرت ہو گی کہ جس کو ہم اپنی آگاہی۔ اور اک یا دل کہتے ہیں وہ روح اعلیٰ یا آگاہی اعلیٰ کا ایک مقید حصہ ہے۔ یعنی ہم میں ایک تو روح مقید یا قلب مقید ہے جس کو ہم جانتے ہیں اور جو ہمارے دماغ میں سوچتا اور سمجھتا ہے۔ دوسری روح مطلق یا قلب مطلق ہے جس کا سایہ یا عکس قلب مقید ہے۔

خداوند تعالیٰ نے دماغ انسانی کو ایک ایسا آلہ بنایا ہے جس کی ساخت اور ترکیب کے مشاہدہ سے عقلیں دنگ ہیں۔ وہ ہمارے تمام خیالات کو جنہیں قلب اپنی حرکت سے پیدا کرتا ہے وصول کرتا ہے۔ مگر وہ ان خیالات یا حرکات قلب کو مقید کرتا ہے اور ان کے پاؤں میں کتنی ہی بیڑیاں ڈالتا ہے۔ ہمارے قلب سے خیالات تو اسی سرعت کے ساتھ نکلتے ہیں جیسے بادلوں میں سے بھلیان۔ مگر وہ ان برق رفتار خیالات کو اس قدر مقید اور محدود کرتا ہے کہ جس کو ہم بیان نہیں کر سکتے۔

قانون فطرت کے موافق یہ خیالات کی بندشیں اور قیدیں مختلف ہیں

ایک گنوار یا جاہل مزدور کی دماغی آگاہی یا روح اسفل نہایت ہی محدود ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کا قلب صرف مہولی کام کاج ہی کی نسبت سوچتا ہے اور اس کے حرکات سطحی اور سست ہوتی ہیں۔ مگر ایک اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ شخص کے خیالات اس قدر وسیع اور سریع ہوتے ہیں۔ جنہیں موجودہ نمونہ کا دماغ تمام و کمال ظاہر کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا۔

اصطلاحی الفاظ کا غلط استعمال اور اسوجہ سے

کتاب کے سمجھنے میں غلط فہمیان

اکثر دیکھا جاتا ہے کہ تصوف کے اصطلاحی الفاظ کے استعمال میں سخت غلطیان کی جاتی ہیں اور اسوجہ سے کتب تصوف کے سمجھنے میں لوگوں کو غلط فہمیان واقع ہوتی ہیں۔ اگرچہ کہ اس مختصر کتاب میں اس قدر گنجائش نہیں کہ ہم تفصیل وار الفاظ مصطلحہ کو بیان کر دیں تاہم اس وقت ہمیں اسی قدر ضروری معلوم ہوتا کہ ہم یہاں صرف روح۔ قلب اور نفس کے باہمی فرق کو بیان کر دیں۔

لوگ عموماً صرف اسی قدر جانتے ہیں کہ انسان میں ایک روح ہی اور ایک جسم ہے۔ غرض کہ وہ روح کو اجالا اس کے تمام مراتب کے لئے استعمال کرتے ہیں اور روح۔ قلب اور نفس کے استعمال میں فرق بھی فرق اور امتیاز کو دخل نہیں دیتے۔ نفس کو کبھی روح کی جگہ پر

استعمال کرتے ہیں۔ اور کبھی قلب کو نفس کی جگہ۔ اسی طرح لوگ روح سفلی اور روح علوی کے استعمال میں بھی غلطیاں اور بے تمیزیاں کیا کرتے ہیں۔

روح کا مقام اعلیٰ ہے اور نفس کا مقام اسفل ہے اور قلب ان دونوں کے بیچ میں ہے۔ اور قلب اور نفس دونوں روح کے مقامات تنزل میں۔ جب وہ روح اس مادی عالم میں مصروف ہوتی ہے تو اس وقت اس کو نفس کہتے ہیں۔ اور جب وہ خدا کی جانب متوجہ ہوتی ہے تو وہ روح کھلاتی ہے۔ اور قلب روح کا وہ مقام ہے جس میں دونوں جانب میلان کی خاصیت موجود ہے۔ پس قلب کا وہ حصہ جو نفس کے ساتھ ملکر کام کرتا ہے اس کو روح سفلی کہتے ہیں۔ اور قلب کا وہ حصہ جو روح کے ساتھ ملجاتا ہے اور کام کرتا ہے وہ روح اعلیٰ کہلاتا ہے گو ہم نے یہاں ان اصطلاحات کو مختصراً بیان کر دیا ہے۔ مگر انہیں وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے مجاہد سے اور ریاضت سے سلوک کے مقامات طے کئے ہیں۔ جن اشخاص نے بغیر سلوک کے اپنے دماغ اور احساس ظاہری سے ان الفاظ کے معنی سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اپنی روح سفلی کے ذریعہ سے سوچنے اور سمجھنے پر اکتفا کیا ہے۔ انہوں نے واقعی ان الفاظ کے معنوں کو اچھی طرح نہیں سمجھا ہے۔ کیونکہ محض کتابوں کے پڑھنے اور اپنی جزوی عقل کو کام میں لانے سے کوئی شخص ان مقامات مشاہدہ نہیں کر سکتا ہے جنہیں یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص

راہ سلوک کے طے کرنے کے بغیر علم تصوف کو اپنی جزوی عقل سے دریافت کرنا چاہیے گا۔ تو وہ کبھی اس علم کو نہ سمجھے گا۔ اور اس کے دلائل اور نتائج جو کچھ وہ از روئے منطق کے ترتیب دے گا غلط ہوں گے۔ یہ علم مشاہدہ کا ہے۔ کوئی خیالی یا استدلالی علم نہیں ہے۔ اسی سبب جو ایک ان پڑہ آدمی راہ سلوک طے کر لیتا ہے وہ ہر مقام کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اور اس کا بیان موثر ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے تمام علوم پڑھا ہوا آدمی بھی تصوف کے مسائل کے سمجھنے میں معذور ہے۔ افسوس ہے کہ اس زمانہ میں بعض حضرات بغیر راہ سلوک طے کئے ہوئے قرآن شریف کی تفسیر لکھنے اور اس کے معنی بیان کرنے کی جرات کر بیٹھتے ہیں۔

روح کے افعال و خواص

سالکین طریقت کو معلوم ہے کہ تمام انسانوں کی روح ایک ہے جیسا کہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے۔ یا ایہا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدہ وخلق منہا زوجہا وبت منہا رجلاً کشیفاً ولساءً۔ یعنی اے لوگو! ڈرو اس بچے رب سے جس نے تمہیں ایک جہی سے پیدا کیا اور اسی سے اسکا جوڑا بنایا اور ان سے بہت سے مرد اور عورتیں پہلائیں۔ مگر اسی ایک روح کا ظہور مختلف قالبوں اور ظروف کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ہوتا ہے۔

و مانع کی ساخت اور ہیئت کے باعث سے اسی ایک روح کے افعال و خواص بھی بدل جاتے ہیں۔

اس بیان کی تصدیق اس واقعہ سے ہو سکتی ہے کہ جب کسی برقی آلہ میں تین قسم کے تار یا ظروف لگائے جاتے ہیں۔ تو اُس برق کا ظہور بھی تین اشکال میں ہوتا ہے۔ حالانکہ برق وہی ایک شے واحد ہے مثلاً جب برق ایک ایسی شیشے کی نلی یا ٹیوب میں سے گزرتی ہے جس میں پارہ بھرا ہوا ہے۔ تو صرف ایک نیل گون روشنی ظاہر ہوتی ہے۔ اور جب چاندی کے تار میں سے گزرتی ہے۔ تو حرارت پیدا ہوتی ہے اور جب تانبے کے تار میں سے گزرتی ہے تو ایک مقام سے دوسرے مقام میں حرکت یا فورس منتقل ہوتی ہے۔ قوت تو ایک ہی ہے مگر تین آلات کے اختلاف سے اس میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔

بجسہ یہی حال انسانی روح کا بھی ہے۔ کیونکہ جب وہ مقام عقل میں کام کرتی ہے۔ تو خیالات پیدا ہوتے ہیں اور جب وہ مقام نفس میں کام کرتی ہے تو خواہشات۔ احساس اور محبت و نفرت۔ حسد و عداوت وغیرہ پیدا ہوتے ہیں اور جب وہ مقام اجسام یا مادے میں کام کرتی ہے تو افعال غیر ارادی جیسے ول اور عضلات کی حرکتیں ہیں پیدا ہوتے ہیں اور ان افعال غیر ارادی میں عادتیں بھی شامل ہیں۔

ان افعال غیر ارادی سے جو جسم کے تمام اعضا میں پائے جاتے ہیں ہمارے دماغ یا روح اسفل کو کوئی تعلق نہیں۔ کبھی کبھی ہمیں کسی خاص موقع

اور محل پر ان افعال کا اور اک ہو جاتا ہے۔ مثلاً جب ناگہانی طور پر ہم پر کوئی لاٹھی مارتا ہے۔ تو فوراً ہمارے علم اور ارادے کے بغیر ہمارے دو وزن ہاتھ اس لاٹھی کی طرف ہو جاتے ہیں۔ روح اعلیٰ کے ان تمام اور اکات کو جو اعضائے جسم میں موجود ہیں ہم احساس طبعی یا تحتی کہتے ہیں۔ جو روح ہمارے دماغ کے ذریعہ سے بحالت بیداری ظاہر ہوتی ہو اور جو ہم میں سوجھتی اور سمجھتی ہے ہم اس کو روح اسفل یا روح بالفعلی کہتے ہیں اور جو روح عام طور سے ہمارے دماغ کے ذریعہ سے بحالت بیداری ظاہر نہیں ہو سکتی۔ اس کو ہم روح اعلیٰ کہتے ہیں اس روح کا ظہور اسی وقت ہوتا ہے جب انسان فن مراقبہ سیکھتا ہے۔ اور حدیث نفس یعنی روح اسفل کے افعال کو معطل کر دینے کی قوت حاصل کر لیتا ہے۔

الغرض روح کے تین رخ یا پہلو ہیں اور ہر رخ کے اعتبار سے ہم اسکو تین قسموں میں منقسم کرتے ہیں۔ اول قسم کو ہم روح طبعی کہتے ہیں۔ کیونکہ وہی ایک روح جب اعضائے جسم میں کام کرتی ہے۔ تو اس کو یہ نام دیا جاتا ہے۔ دوسرے قسم کو ہم روح بیدار کہتے ہیں۔ یہ حالت بیداری میں کام کرتی ہے۔ تیسری قسم کو ہم روح اعلیٰ کہتے ہیں جو بحالت مراقبہ یا تعطل حواس خمسہ ظاہری ظاہر ہوتی ہے۔

روح طبعی جسکی افعال غیر ارادی یا اضطراری ہوتے ہیں

روح طبعی کے آلات اعصاب متاثرہ یا سمپتھٹک زوس اور سیری برو

اسپائنل سسٹم یا صلب کے بعض مرکز ہیں جن کے ذریعہ سے اس کے افعال ظاہر ہوتے ہیں۔ روح طبعی کے فرائض یہ ہیں کہ وہ جسم کے سیلز یا ذرات کو انضباط میں رکھتی ہے۔ اور جسم کے مختلف اعضا کو افعال کے ترتیب دیتی ہے اور جو افعال بغیر ہمارے خیال کے ان اعضا سے اضطراری طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کی یادداشت کو بھی محفوظ رکھتی ہے۔

اسی روح طبعی کو ہم عادت۔ عقل حیوانی۔ خلقی۔ افعال خلقی اور طبعی کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں۔ مثلاً جب ہم لکھنا سیکھتے ہیں۔ تو ہم کو لکھنے کی پہلی کوششوں میں مشکل اور تکلیف محسوس ہوتی ہے اور ہمارا دماغ لکھنے کے فعل کو محسوس اور اوراک کرتا ہے۔ اور اس وقت لکھنا کا فعل ارادی ہوتا ہے۔ ہم قلم چلانے سے پہلے سوچتے اور لکھنے کا ارادہ کرتے ہیں اور پھر بڑی مشکل سے ایک ایک حرف بناتے ہیں مگر جب ہم ایک مدت تک اس لکھنے کے عمل کو جاری رکھتے ہیں اور لکھنے میں ہمیں پوری مشاقی حاصل ہو جاتی ہے تو اس وقت کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی اور خیال اور ارادہ دونوں غائب ہو جاتے ہیں۔ اور لکھنا فعل غیر ارادی یا اضطراری ہو جاتا ہے یعنی خود بخود ہاتھ حرکت کرتا اور قلم لکھتا ہے اور دماغ اس کی طرف مصروف نہیں رہتا۔ بلکہ وہ ان خیالات اور احساس کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔ جنہیں وہ لکھنا چاہتا ہے اسی طرح سے جب کوئی سائیکل پر چڑھنا سیکھتا ہے۔ تو پہلے اسکی

ساری توجہ اور خیال اس بات پر رجوع رہتا ہے کہ سائیکل اور ہر اویز ہوجا
 اور کسی دیوار یا درخت سے نہ ٹکرا جائے۔ مگر مشق سے یہ خیال جاتا رہتا ہے
 اور ہم بے تکلف اس پر ہر جگہ چڑھتے ہیں۔ اس طرح یہ توجہ دماغ
 یا روح بیدار سے روح طبعی کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اور روح طبعی
 خود اس کام کو کرنے لگتی ہے جس کو پہلے دماغ کیا کرتا تھا۔ اس وقت
 ہمارا دماغ یا روح بیدار سائیکل کی ذمہ داری سے بری الذمہ ہو جاتی ہے۔
 مگر جب کوئی سائیکل پر خوب چڑھنے والا شخص پہلی بار کسی ٹرائسکل
 سوار ہوتا ہے۔ تو اس وقت اسکی حالت قابل ملاحظہ ہے۔ کیونکہ سائیکل اور
 ٹرائسکل کے چڑھنے میں ایک قسم کا فرق ہے۔ سائیکل میں تو وزن درست
 رکھنے کے لئے جسم کو برابر رکھنا پڑتا ہے اور ٹرائسکل میں صرف مینڈل بار ہی
 کی جانب توجہ رکھنی پڑتی ہے۔ چونکہ اب اسکو ایک نئی عادت کرنی
 پڑتی ہے۔ اس لئے اسے پہلی پھل ٹرائسکل پر چڑھنا وغیرہ ہوتا ہے اور
 وہ اس لوہے کے گھوڑے کو کسی خندق یا نالی میں گرا دیتا ہے۔
 جب مشق سے کوئی حرکت طبعی ہو جاتی ہے۔ تو پھر اس کو چھوڑ کر
 دوسری نئی حرکت کی عادت ڈالنے میں وقت لگتا ہے۔ کسی حرکت
 طبعی اور غیر ارادی بنانے کے لئے ضرور ہے کہ ایک عرصہ دراز تک اس
 حرکت کی مشق کی جائے۔ پہلے تو اس حرکت کے کرنے میں خیال اور ارادے
 دونوں سے کام لیا جائے گا بعد ازاں رفتہ رفتہ مشق اور اکتساب یہ
 دونوں باتیں جاتی رہیں گی۔ اور پھر وہ حرکت طبعی اور غیر ارادی ہو جائیگی

ساکین اسی اصول کی بنیاد پر عمدہ اخلاق اور عادات اور دیگر کمالات روحانی حاصل کرتے ہیں اور یہی عام اصول ہے جس پر تمام دینی اور دینی کمالات منحصر ہیں۔

روح اعلیٰ

روح اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے خیالات اور احساس پیدا ہوتے ہیں جو معمولی دماغوں میں اتر کر نہیں آتے۔ کیونکہ عوام الناس کے دماغ بقدر مقید اور محدود ہوتے ہیں کہ وہ ان عالی خیالات اور احساس کو جذب نہیں کر سکتے اور نہ ان میں ان کے ظہور کی قابلیت اور صلاحیت ہوتی ہے۔ اسی روح اعلیٰ سے اولیاء اللہ اور نبیوں اور مشاہیر اشخاص کے دماغوں میں القاء و ارواح اور انکشاف ہوتے ہیں اور لوگ ان کے فوائد کثیر حاصل کرتے ہیں۔ ہماری زندگی کا اعلیٰ رخ انہیں خیالات اعلیٰ کی ایک تصویر ہے۔ جب تک کسی شخص میں یہ روح اعلیٰ پائی نہ جائے اس وقت تک واقعی وہ انسان کہے جانے کے لائق نہیں۔ اگر کسی آدمی میں یہ روح اعلیٰ موجود نہ ہو۔ تو کہا جائے گا کہ وہ صرف قالب انسانی تو رکھتا ہے۔ مگر یہ قالب روح انسانی سے خالی ہے۔ ایسی صورت میں وہ ہڈیوں۔ عضلن۔ اور رگوں کا ایک مجموعہ ہو گا جیسے کہ اور حیوان ہوا کرتے ہیں۔ جس دماغ میں خیالات اعلیٰ نہ پائے جائیں تو وہ صرف سفید گوشت یا مغز کے ایک کردی گولے سے زیادہ وقت نہیں رکھتا۔

انسان روح اعلیٰ کا نام ہے۔

بعض اوقات روح اعلیٰ سے دماغ میں اعلیٰ درجہ کے خیالات کا سرچشمہ بہنے لگتا ہے۔ اور یہ احساس اور خیالات عالیہ اکثر موسیقی دان، اشخاص اور شاعروں کے دماغوں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اسی واسطے فرمایا گیا ہے کہ الشعراء تلامز الرحمن یعنی شاعر حضرت رحمان کے شاگرد ہیں ان خیالات اور احساس کی خوبصورتی اور تناسب سے وہی لوگ لطف حاصل کرتے ہیں جنہیں فنون لطیفہ سے کچھ بہرہ ہوتا ہے۔ بعض وقتہ، اسی روح کے اعلیٰ مقام سے بعض اشخاص کے دماغ میں جرات اور جوش ظاہر ہوتی ہے اور وہ دوسروں کی جان بچانے کے لئے اپنی جانوں کو تھلک میں ڈال دیتے ہیں۔ اور بعد ازاں بہادر اور سورا کے لقب سے ملقب ہوتے ہیں۔ یہی روح اعلیٰ تھی جس نے مجاہدین کو ہر ایک مذہب و ملت میں شہیدوں کا خطاب دلایا اور جس نے ایک بہادر ہنر کی طرح بہاؤ کو یعنی نفس کشی میں ان سے اعلیٰ درجہ کی ریاضت اور مجاہدے کرائے۔

عالم مثال کے تجربوں کی یاد

بعض اوقات جب ہم رات کو خوب آرام سے سو کر جاگتے ہیں۔ تو ہمیں اپنے وہ تجربے یاد رہتے ہیں جنہیں ہم نے بحالت غفلت عالم مثال میں حاصل کی تھے مگر یہ بات عام نہیں کہ جو کچھ خواب ہم رات کو دیکھیں وہ ہمیں صبح کو یاد رہیں اکثر جو کچھ ہم عالم مثال میں بحالت غفلت دیکھتے ہیں وہ ہم کو یاد

نہیں رہتا۔ کیونکہ دل میں دن بھر کے کاموں کے اوہورے خیالات یا اون کے ٹوٹے پھوٹے مختلف لقصورات منتشر طور پر جمع رہتے ہیں۔ وماغ کوئی خود سوچنے سمجھنے والی چیز نہیں ہے۔ جس بات یا جس خیال پر وہ لگایا جاتا ہے اور جس خیال کی حرکت اس میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی کو وہ کل کی طرح وہو ریا کرتا ہے۔ جب دل کسی خاص طرف متوجہ رکھا نہیں جاتا اور وہ اپنی حالت پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ تو دماغ میں کوئی زوردار خیالات یا قصور پیدا نہیں ہوتے۔ اور ایسی صورت میں ہمارے خیالات نہایت ہی متلون اوہورے۔ ناقص اور بے نتیجہ ہوا کرتے ہیں اور کوئی قائمہ نہیں دیتے۔ جیسے کوئی چشمہ پہاڑ سے گر کر ایک بہت بڑے ریت کے میدان میں چارون طرف پھیل جائے تو اُس پانی سے ایک گہائس کا تنکا بھی نہ بہے گا۔ مگر جب وہی پانی ایک چھوٹی نہر میں ڈالا جاتا ہے۔ تو اس میں کشتیاں چلنے لگتی ہیں اور تمام ملک کی زمین سرسبز ہو جاتی ہے۔

طبعاً جب ہم خواب یا سونے سے بیدار ہوتے ہیں اور ہماری روح اس عالم غیر مری سے پھر اس قالب میں داخل ہوتی ہے تو ہم اپنے دماغ کو طرح طرح کے خیالات ناقص اور نامکمل سے بھرا ہوا پاتے ہیں۔ جن کا دور کرنا مشکل ہے مگر تھوڑی سی محنت اور توجہ سے دماغ کو ایسا تربیت کر سکتے ہیں کہ جو کچھ سونے کی حالت میں ہم عالم مثال میں دیکھیں وہ ہمیں بحالت بیداری یاد رہے۔ اور ہم اس سفر آخرت سے جو ہمیں ہر روز درپیش ہوا کرتا ہے نواد کثیر اٹھایا کریں۔ بعض معمولی آدمیوں کو بھی باوجود اس کے کہ اون کے دماغ کو

کوئی تربیت نصیب نہیں ہوئی۔ عالم مثال کے واقعات یعنی خواب یاد رہتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے انھیں کبھی سچے خواب بھی پڑتے ہیں۔ سچے خواب واقعات مثالی ہیں جو کبھی ہمیں بعد بیداری یاد رہتے ہیں۔

آئندہ واقعات کا مشاہدہ

عوام الناس بڑی مشکل سے اس بات کو یاد کر سکتے ہیں کہ انسان آئندہ ہونے والے واقعات کو بعینہ خواب یا حالت مراقبہ میں دیکھ سکتا ہے اور اس کو ان واقعات کی پوری یاد بیداری کے بعد رہ سکتی ہے۔ اگر ہم ایک چھوٹی سی پہاڑی پر کھڑے ہوں جس کے اطراف ایک ریلوے لائن واقع ہے اور ہم دیکھیں کہ دو ٹرکوں سے دو ریلین اسی ایک پٹری کے مقابل کے سمتوں سے آرہی ہیں۔ تو ہم عقل سے یہ دریافت کر سکتے ہیں کہ کس مقام پر کس وقت ان میں تصادم واقع ہوگا اور آپس میں ٹکراؤ کھائیگی۔ حالانکہ جو لوگ ان ریلوں میں سوار ہوں گے انھیں اس آئندہ واقع کی ذرا بھی پہلے سے خبر نہ ہوگی۔

اسی طرح جب ہم عالم مثال میں ہوتے ہیں جو بمنزلہ پہاڑ کے ہے۔ تو ہمیں اہل دنیا کے آئندہ واقعات اپنی باطنی آنکھ سے نظر آتے ہیں۔ اور ہم انھیں دیکھ کر آئندہ کی نسبت پیشین گوئی کر سکتے ہیں۔

عالم آخرت سے تعلق پیدا کرنا یا عالم ملکوت

۸۶ اور حیرت کا کھانا

جب ہم سخت مجاہد سے اور ریاضت سے اپنے جسم و مبلغ اور اعصاب کو ظاہر اور پاک کرتے ہیں اور اس میں عالم آخرت کی تار برقیان رسید یا وصول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ تو اس وقت ہماری باطنی نظر کھل جاتی ہے اور ہمیں اسرار غیبی دکھائی دینے لگتے ہیں۔ مگر یہ باطنی قوت مصلحت ہر شخص میں مختلف ہوتی ہے۔ یہ قوت خلقی طور پر آدمی میں موجود ہے۔ مگر اسکے ظہور اور نمود ترقی کے لئے اکتساب اور مجاہد سے کی ضرورت معمول اور اس ذاتی قوت میں فرق یہ ہے کہ معمول بنانے کی حالت میں ہم دوسری روحانیت کا کام لیتے ہیں۔ اور اپنی ذاتی قوت سے ہم خود عالم مثال کی سیر کر سکتے ہیں۔ معمول صرف ایک درمیانی شخص سے ہے جس کے ذریعہ یا وساطت سے اور روح عالم مثال کے حالت بیان کرتی ہیں۔ اور ہم اپنی باطنی ترقی سے خود عالم مثال کی اشیا کو دیکھتے ہیں۔

قدیم زمانہ سے ہندوستان میں اس باطنی قوت کو ترقی دینے کے وہی ذریعہ رائج ہیں۔ ان میں سے ایک تو وہ ہے جس کو ہم ”ہٹ جوگ“ یعنی نفس کشی کہتے ہیں۔ اس طریقہ کا اصل اصول یہ ہے کہ بعض جسمانی اکتساب اور اشغال کے ذریعہ سے جسم اور حواس خمسہ کے احساس اس قدر معطل کر دیے جائیں کہ ان میں خارجی اشیا کی تحریک ہی پیدا نہ ہو۔ جیسے آنکھوں یا کانوں کا بالکل بند کر لینا وغیرہ ہے۔ چونکہ ہٹ جوگ صرف جسم ہی سے تعلق رکھتا ہے تو اس لئے اس کے اکتساب سے صرف ابتدائی باطنی قوت ظاہر ہوتی ہے۔

اور باقی قوائے دماغی میں ترقی نہیں ہوتی۔ اور روحانی قوتیں بدستور باقی
پست حالت میں رہتی ہیں۔

عالم آخرت کے انکشاف کا دوسرا طریقہ راج جوگ ہے۔ یہی وہ طریقہ
جس کے وسیع سے تمام روحانی اور قلبی قوتیں ترقی کرتی ہیں۔ اور اس
جوگ کے وسیع سے جس کو ہم مراقبہ کہتے ہیں انسان اپنی توجہ اور قوت ارادہ کی
استقامت ترقی دے سکتا ہے کہ وہ جب چاہے اپنی توجہ کو اس عالم مادی سے
ہٹا کر دوسرے عالم یا مثال وغیرہ کی طرف کر لے اور اس تدبیر سے وہ غیر مری
عالموں میں حسب دلخواہ پہنچ جائے۔ اور ان کی اشیاء کو اپنی باطنی آنکھ سے مشاہدہ کرے۔

فصل ۲۔ عالم مثال کے دیکھنے کی ادنیٰ ابتدائی قوت

عالم مثال کے دیکھنے کی ادنیٰ ابتدائی قوت قدیم قوم اطلاعات میں

بڑے بڑے کامل مرشدوں اور مہاتماؤں نے اپنے علم باطن سے
یہ دریافت کیا ہے کہ نہایت ہی قدیم زمانہ میں ایک بہت وسیع براعظم
آباد تھا جو اس ہمارے زمانہ میں غرق آب قفس ہے اور ہم اس سمندر کو جو
اس آبادی پر موج زن ہے بحر اطلاعات کہتے ہیں۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ
وسیع مقام پر ہزاروں شہر اور گاؤں آباد تھے۔ انگور و ناریل اور دیگر میوہ جات
سرسبز باغات اپنی خوشنمائی سے دلوں کو تروتازہ کرتے تھے۔ اور ہرے ہرے

اہلہائے کھیت کو سنو سلسل نظر کو اپنے ولفرب منظر سے سرور بخشتے تھے۔
 ہر لون کے گلے اور شیر چیتوں کے تنہا مقام جنگلون اور جھاڑیوں میں بکثرت
 دکھائی دیتے تھے۔ اور آج وہ زمانہ ہے کہ جد ہر نظر اٹھاؤ سوا پانی کے
 اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ وہ سارا خوشنامنظر نظروں سے غائب ہو گیا۔ نہ
 وہ تمدن رہا اور نہ وہ تہذیب و شائستگی۔ کل من علیہا فان وبقاہو ربک
 ذوالجلال والاکرام۔ نہ وہ انسان رہے اور نہ وہ اون کے مکانات اور
 مصنوعات رہے۔ آخر کو وہی ایک ذات جو ہمیشہ تھی اور ہمیشہ رہیگی
 باقی رہی۔ اگرچہ کہ یہ قدیم زمانہ کی تہذیب بعض لحاظ سے اس ہمارے زمانہ
 کی شائستگی سے بڑھی ہوئی تھی۔ مگر اس کے مظالم اور گناہوں اور نافرمانیوں نے
 اس قدر وسیع ملک کو غرق آب و خجالت کر دیا اور دنیا کو یہ دکھا دیا کہ خداوند تعالیٰ
 عادل حقیقی ہے جو کچھ خرابی اور تباہی آتی ہے وہ انسان کے اعمال بد کا نتیجہ ہے
 شعر۔ ہرچہ بر تو آید از ظلمات و غم : این زبیا کی و گستاخیست ہم
 انھیں غیبی جبرٹوں اور باطنی انکشافوں سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ
 اس برا عظم مغروق کے باشندوں پر عالم مثال کھلا ہوا تھا۔ اور وہ اپنی آنکھوں سے
 اس کو اس طرح دیکھتے تھے کہ انھیں یہ دنیا اور عالم مثال دونوں باہم ملے ہوئے
 دکھائی دیتے تھے۔ مگر اس قوم کے عقلی قوانین کوئی زیادہ ترقی نہ تھی۔ انکی
 دماغ اس قدر ترقی یافتہ نہ تھے جس قدر کہ اس ہمارے زمانہ کے دماغ ہیں۔
 ان میں بہ نسبت عقل کے احساس دباؤ تھے۔ وہ سوچتے کم تھے۔ مگر محسوس
 زیادہ کرتے تھے۔ وہ کسی ایک بات کو دیر تک سوچنا اور ان کے اسباب

دنتائج پر غور کرنے کی زیادہ قابلیت نہیں رکھتے تھے۔ مگر وہ جلد ہی مشتعل ہو جانے اور زیادہ عشق لغزت سے جوش میں آ جانے کی بہت زیادہ قابلیت رکھتے تھے۔

اب یہاں پر خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے دماغ اور اعضاؤ جسمانی کی ساخت میں ایسی کون سی خصوصیت تھی کہ انہیں عالم مثال خلقاً کھلا ہوا تھا۔

انسانی جسم میں عالم مثالی کے مرکز

اکثر اشخاص جو فن تشریح یا جراحی سے واقف ہیں انہیں معلوم ہے کہ انسان کے جسم میں دو قسم کے اعصاب ہیں۔ ان میں سے ایک کو تو سیری بریڈیل کہتے ہیں جس میں دماغ اور حوام مغز شامل ہے اور دوسرے کو اعصاب ہمدردی (سمپٹیٹک زوس) کہتے ہیں۔ یہ اعصاب ریڑھ کے مہرون کی دونوں جانب واقع ہیں اور ان سے باریک اعصاب کا جال تکثر جسم کے دونوں جانب پھیلا ہوا ہے۔ کہیں کہیں ان اعصاب ہمدردی کا جال بہت باریک اور گنجان ہو گیا ہے۔ جنہیں اہل تشریح عقد (پلیکس) کہتے ہیں۔ ان کا نمٹھون میں سے عقد شمسی (سولر پلیکس) زیادہ مشہور و معروف ہے۔ مگر اہل تشریح یا ڈاکٹرون کو ان عقود یا چکرون کی باطنی خصوصیت زیادہ معلوم نہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ ہر چکر یا عقد عالم مثال سے ایک بہت بڑا ربط رکھتا ہے اور انہیں چکرون پر علم اجسام اور عالم مثال و دونوں باہم اتصال

قوی رکھتے ہیں۔ قوم اطلانت میں یہی چکر زیادہ ترقی کر گئے تھے۔ اور بحیثیت اجتماعی تمام اعصاب ہمدردی ان میں پورے طور پر نمایاں تھے۔ اور انہیں ابھڑے ہوئے اور ترقی یافتہ چکروں اور اعصاب ہمدردی کے ذریعہ سے عالم مثال کی تحریک بکثرت اُن تک پہنچتی تھی۔ اور وہ عالم مثال کی چیزوں اس عالم مادی کی اشیاء کی طرح بخوبی دیکھتے تھے۔ ان کی روحانی آگاہی یا تجربان ابھڑے ہوئے اعصاب ہمدردی میں اسی طرح کام کرتی تھی جب طرح کہ وہ ادن کے غیر ابھڑے یا ناترست یافتہ دماغوں میں کام کرتی تھی۔ اور اس کارروائی کا نتیجہ صرف یہی نہ تھا کہ ان پر عالم مثال کھلا تھا۔ بلکہ اس کے ساتھ یہ بات بھی تھی کہ آجکل جو باتیں ہم میں امور طبعی یا غیر ارادی ہیں وہ انہیں طبعی نہ تھیں بلکہ ارادی اور فکری تھیں۔ مثلاً حرکت قلبی جو ہم میں ایک امر طبعی یا غیر ارادی ہے یعنی خود بخود قلب کی حرکت ہوتی رہتی ہے یا معدہ کا فعل ایک امر طبعی ہے جو اپنے آپ واقع ہوتا رہتا ہے یہ سب امور طبعی اس قوم اطلانت کو غیر طبعی تھے۔ یعنی ان کی حرکت قلب معدہ حرکت ارادی تھی۔ اور انہیں بالارادہ قلب اور معدے کو حرکت دینا پڑتا تھا اور وہ قلب اور معدہ کی حرکت کو محسوس کرتے تھے۔

گو قوم اطلانت پر عالم مثال کھلا ہوا تھا۔ مگر اس عالم اور اس دنیا و دوزخ کی تصورات اور معلومات اُن کے ذہنوں میں اجمالی اور سطحی تھیں۔ کوئی تفصیلی علم انہیں دنیا کا یا عالم مثال کا حاصل نہ تھا۔ جو اس دمانہ کے ایک سالک کو حاصل ہوتا ایک باضابطہ تربیت یافتہ سالک مخصوص چکروں کو کام میں لاتا ہے اور اس

غیر مری دنیا کی اشیاء کو تفصیل وار دیکھنا ہے۔ یہ مخصوص چکر یا سرکڑا سمجھنا
تعلق رکھتے ہیں اور انہیں عالم مثال اور دیگر عالموں کے ساتھ ایک
خاص خصوصیت ہے۔

قوائے عقلی کی ترقی

صد ہا برسوں کے گزرنے کے بعد انسان کے قوائے و مافی میں ترقی
ظاہر ہوتی ہے۔ اور اس عقلی ترقی کے مطابق و مافی کے واسطے اور ساخت
میں بھی ترقی ہوتی ہے۔ اور ساتھ ہی اس ترقی کے اعصاب ہمدردی کے
افعال اور احساس بتدریج طبعی اور غیر ارادی ہوئے ہیں۔ کیونکہ اس و مافی یا
فکر سے ان کی ذمہ داری یا خبر داری کا بار اٹھ گیا ہے۔ قوائے عقلی اور
فکری کا نمو اور قوائے اعصاب ہمدردی کی جگہ پران کا قایم ہونا ہزاروں
اور لاکھوں برس کے عرصہ کتاب میں تکمیل کو پہنچا ہے۔ اور اب تک
باوجود اس مدت و راز کے ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جن کے
قوائے عقلی اس قدر پست اور ناترقی یافتہ ہیں کہ بہن اس گزشتہ مفقود قوم
اطلاست کی یاد دلاتے ہیں۔ جن میں عقل تو کم تھی۔ مگر احساس زیادہ تھے۔
یہ کچھ کم تعجب کی بات نہیں کہ قوم اطلاست کو فنا ہوئے لاکھوں برس کا زمانہ
گذرا اور اب تک بعض قوائے احساس کی وہی ابتدائی حالت قائم ہو۔
لوگوں کو اکثر اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ بعض افخاص میں احساس
تو زیادہ ہیں مگر وہ عقل تو امین معمولی آدمیوں سے زیادہ نہیں۔ ان کی عقلیں

ایسی روشن نہیں جیسے کہ ان کے احساس۔ وہ مقدمات منطقی کو ترتیب دے نہیں سکتے۔ مگر ان میں احساس کا مادہ بہت بڑھا ہوا ہے۔ یہ بات کوئی تعجب کی نہیں۔ اس لئے کہ ان کے قوائے عقلی میں ابھی زیادہ ترقی نہیں ہوئی اس ترقی کے لئے انہیں اس دار فانی میں صد ہا مرتبہ مرمر کے پیدا ہونا پڑیگا اور تدریج ان کے قوائے عقلی سنو کرین گے۔ اور یہ ابتدائی حالت دماغی غائب ہو جائے گی۔ اور اس کی جگہ عقلی قوا کی ترقی پیدا ہوگی۔

سنوولی آومیون میں جن کی تمدنی یا عقلی ترقی کسی قدر ہوئی ہے۔ یہ عالم مثال کے دیکھنے کی قوت تدریج کم ہوتے ہوئے مفقود ہو گئی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی دماغی اور عقلی ترقی بالمتناسب ظاہر ہوئی ہے۔ یعنی جس قدر عقل ترقی کرتی جاتی ہے۔ اس قدر عالم مثال کے دیکھنے کی قوت گھٹتی جاتی ہے۔ مگر یہ عقلی ترقی انسان کو کوئی ایک زندگی یا جنم میں حاصل نہیں ہوئی۔ بلکہ صد ہا زندگیوں اور جنموں میں وہ اس مقام پر پہنچا ہے۔ اس بیان اس بات کی تشریح اور توجیہ بخوبی کی جاسکتی ہے کہ اس ہمارے زمانہ میں بعض اشخاص ایسے موجود ہیں جن کے قوائے عقلی تو بہت ہی گھٹے ہوئے ہیں۔ مگر وہ خلقتاً عالم مثال کے دیکھنے کی قوت رکھتے ہیں۔ بعض اوقات ہمارے دل میں خود بخود پریشانی اور بیقرار ہی محسوس ہوتی ہے۔ جسکو ہم طبیعت کا گھبراہٹ کہتے ہیں۔ اور یہ پریشانی اور گھبراہٹ کسی آئندہ مصیبت یا حادثہ کی پیشین گوئی کرتی ہے۔ مگر ہم اس بات کو ذرا بھی نہیں سمجھتے۔ اور اپنی اس قوت ادراک مثال سے بالکل بے خبر ہیں۔

مکن ہے کہ بعض اشخاص ہمارے اوپر کے بیان کو تسلیم نہ فرمائیں۔ جسکی بنیاد انکشاف اور علم لدنی پر ہے۔ اس لئے ہمیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انکی تنفی کسی عقلی دلیل سے کر دی جائے۔

علم حیوانات کے ماہرون نے اس بات کا مشاہدہ متواتر کیا ہے کہ بعض جانور طوفان یا کسی حادثہ کے واقع ہونے سے پہلے اس سے واقف ہو جاتے ہیں۔ جیسے کہ اونٹ عربستان کے ریتلے میدانوں میں جب طوفان ہوا آنے والا ہوتا ہے تو ریت میں اپنے منہ چھپا لیتے ہیں۔ اسی طرح کتو اور بلیاں جب کوئی زلزلہ آنے کو ہوتا ہے۔ تو کسی پناہ کی جگہ چھپ جاتی ہیں۔ الغرض اکثر حیوانات آئندہ کے حوادث اور آفات سے پہلے ہی واقف ہو جاتے ہیں۔ جس سے بخوبی ثابت ہے کہ ان پر عالم مثال کھلا ہوا ہے۔ مگر انسان عام طور پر ان حوادث و ہر سے اس وقت تک واقف نہیں ہوتے جب تک وہ ظہور میں نہ آجائیں۔ ظاہر ہے کہ آدمیوں میں حیوانات کی نسبت دماغ ترقی یافتہ ہے۔ مگر قوائے احساس کم ہیں۔ اسی طرح جنگلی قوموں میں بعض اشخاص پر عالم مثال کھلا ہوا ہے۔ مگر عقلیں ان میں کم ہیں۔ برخلاف اس کے شہری اور تمدنی اشخاص میں قوائے احساس نہایت ہی کم زور ہیں اور بہت ہی کم ان میں عالم مثال کے دیکھنے کی قوت پائی جاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ نوزائیدہ بچے پر عالم مثال کھلا ہوتا ہے اور وہ پہلے اسی کو دیکھا کرتا ہے۔ اور جس قدر اس کے حواس ظاہری ترقی کرتے جاتے ہیں

اور اس مادی عالم کی طرف متوجہ ہوتا جاتا ہے اسی قدر عالم مثال اس کی نظر و
 سے غائب ہوتا جاتا ہے۔ بعد ازاں جو اس غمہ اور دماغ کی ترقی کے ساتھ
 اس میں عالم مثال کے دیکھنے کی قوت سلب ہوتی جاتی ہے۔ یہ سب
 واقعات جن کی تکذیب کی کسی کو جرات نہیں ہو سکتی اس پر پوری شہادت
 دیتے ہیں کہ دنیا میں قوم اطلاعات موجود تھی اور اس پر عالم مثال کھلا ہوا
 تھا اور دماغی ترقی اور تمدن اور معاشرت انسانی کے ساتھ ساتھ اس
 قوت دید مثال میں زوال ہوتا گیا ہے۔

درمیانہ حالت

اس زمانہ میں انسان کی حالت درمیانہ ہے۔ واقعی اس کو دماغی اور
 عقلی ترقی حاصل ہوئی ہے مگر ساتھ ہی اس کے اسکی وہ عالم ابتدائی باطنی نظر
 جاتی رہی ہے جس سے بالاجمال وہ عالم باطن یا مثال کا مشاہدہ کرتا تھا۔
 اگرچہ بعض اشخاص نے اس زمانہ میں عالم مثال کی وہ تیز نظر پیدا کی ہے جو
 اس کے تفصیلی حالات سے لطف اٹھاتی ہے۔ جو لوگ اس عنصری
 قالب کے ساتھ عالم باطن یا مثال میں رہنے کی عادت کرتے ہیں انہیں کی
 نظر باطنی مکمل جاتی ہے اور وہ عالم آخرت کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں
 اور سب وہ زمانہ قریب آگیا ہے کہ اکثر اشخاص میں عالم مثال کے دیکھنے کی
 باطنی نظر اچھی طرح سے پیدا ہو جائے گی۔ کیونکہ اکثر اشخاص کے دماغ اور
 اعصاب ترقی کر چکے ہیں۔ اور ان کی قلبی صور و حالی قوتیں نور و برہنہ کی

اور ان میں اس قدر قوتِ اروہی کا ظہور ہو چکا ہے کہ اب وہ عالم مثال کے مشکل اور دقیق مسائل کو بخوبی سہولت کے ساتھ حل کر سکتے ہیں۔

اس زمانہ میں ہمیں اختیار ہے کہ ہم یا تو آگے بڑھیں اور ترقی کریں یا تنزل کریں اور پیچھے ہٹیں۔ اگر ہم اپنی باطنی نظر کو ترقی دین گے اور اعلیٰ درجہ کے روحانی قوتیں حاصل کریں گے۔ تو ہمیں ترقی نصیب ہوگی۔ اور اگر اسی ابتدائی نظر کو پھر از سر نو ٹالائیں گے۔ تو واقعی ہمیں ایک قسم کا تنزل ہو جائیگا جنہوں نے روحانی قوا کا اکتساب پورے طور سے کیا ہے۔ اور کسی مرشدِ کامل کی نگرانی میں راہِ سلوک کے مختلف مقامات طے کئے ہیں۔ وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ آج کل عالم مثال کے کھلنے کے جو طریقے یورپ اور امریکہ میں شائع ہیں ان سے کوئی روحانی ترقی نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ انساہمیں اور پیچھے کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ ان طریقوں سے عالم مثال کے اسفل طبقات بہت جلدی اور آسانی سے کھل جاتے ہیں۔ برخلاف اس کو اعلیٰ درجہ کی باطنی نظر مدتوں اور وقتوں کے بعد کھلتی ہے۔ ان دونوں طریقوں میں جو یورپ اور ہندوستان میں رائج ہیں فرق اتنا ہی ہے کہ ایک تو جلدی کی راہ ہے اور ایک دیر کی۔ صرف جلدی اور دیر کا فرق ہے مگر جو ترقی دیر میں ہوتی ہے وہ اعلیٰ درجہ کی ہے۔ اور جو جلدی ہوتی ہے وہ محض طمعِ کاری اور نمایشی ہے۔

اور دوسرے چکر اور مرکز

ان مرکزوں اور چکروں کے علاوہ جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں دوسرے ای

مرکز اور چکر بھی ہیں جو عالم مثال کے دیکھنے کے لئے بعض اوقات استعمال کئے جاتے ہیں۔ علم افعال اعضاء (فزیالوجی) سے دریافت ہو چکا ہے کہ حواس خمسہ میں سے ہر ایک آلہ حس اعصاب کے ذریعہ سے دماغ سے ملا ہوا ہے اور ہر حس کا مرکز دماغ میں موجود ہے۔ مگر یہ بات ڈاکٹرون اور طبیبون کو معلوم نہیں کہ ہر مرکز دماغی کا ایک مرکز مثالی بھی موجود ہے۔ اور ان مثالی مرکزوں اور دماغی مرکزوں میں اتصالی تعلق ہے۔ اور اس طرح جسم کثیف جسم لطیف سے ربط اور ضبط رکھتا ہے۔

جب غصہ آکھاب آنکھ پر پڑتی ہے تو آنکھوں کے اعصاب بینائی کو حرکت ہوتی ہے اور یہ تحریک انھیں اعصاب کے ذریعہ سے دماغ کو مرکز بینائی کو پہنچتی ہے یہ تحریک یہاں ختم نہیں ہو جاتی۔ بلکہ دماغ مثالی کے مرکز بینائی تک پہنچتی ہے اور وہاں شعاع کی روشنی اور رنگ محسوس ہوتے ہیں۔ تمام احساس وجود مثالی میں پیدا ہوتے ہیں۔ جسم عنصری کسی چیز کو محسوس اور معلوم نہیں کرتا۔ صرف جسم مثالی ہی ہر شے کو محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ مادی دماغ محض ایک آلہ ہے جس کے توسط سے خارجی تحریک باطن کو پہنچتی ہے اور باطنی تحریک خارجی یا ظاہری جسم تک آتی ہے۔ مگر یہ نقل و حرکت نہایت ہی سریع اور قوی ہے۔

آلات حواس خمسہ میں سے ہر آلہ حس مینی ناک۔ کان۔ آنکھ وغیرہ کلاہیک مرکز مادی دماغ میں اور ایک مرکز وجود مثالی میں موجود ہے۔ مگر اس سے مطلب یہ نہیں ہے کہ عالم طہ پر یہ مثالی مرکز کوئی آلات احساس ہیں اور ہاں

ناک - کان اور آنکھ کی طرح شکل و صورت رکھتے ہیں عموماً وہ تو صرف ایک قسم کے تعلقات ہیں جن کے ذریعہ سے روح تک خارجی تحریک پہنچتی ہے - مگر جب بعض اعمال و اشغال کئے جاتے ہیں جنہیں ہم آئندہ فصل میں بیان کریں گے - تو اس وقت مشق اور کتاب سے یہ مثالی مرکز یا چکر ترقی کر جاتے ہیں - اور ابتدائی مثالی چشم و گوش میں ظاہر ہوتے ہیں جنہیں باطنی آنکھ اور کان کہتے ہیں - انہیں ابتدائی باطنی چشم و گوش کے ذریعہ سے ہم عالم غیب کی اشیا کا مسائنہ کرنے لگتے ہیں - اور ہمارا دماغ ان غیبی معلومات کو یاد رکھتا ہے - اور اس وقت یہ کہہ جاسکتا ہے کہ ہم پر عالم مثال کے طبقات کھل گئے -

دوسری آنکھ یعنی چشم باطنی

یہی وہ چشم بصیرت یا باطنی آنکھ ہے جس کو اہل سلوک اپنی محنت اور ریاضت سے پیدا کیا کرتے ہیں اور بعض اوقات عام لوگوں کو بھی جنہوں نے کوئی ذکر و شغل نہیں کیا یہ آنکھ نصیب ہو جاتی ہے بعض نیک اشخاص اور پرہیزگار مرد اور عورتیں ایسی پائی جاتی ہیں جنہیں خود بخود بغیر کسی معین اور مقررہ طریقہ سلوک کے یہ چشم و گوش باطنی نصیب ہیں - ان لوگوں میں مثالی مرکز اس قدر ابھرے اور نمو کئے ہوئے ہیں کہ وہ اپنے سامنے عالم مثال کے لوگوں اور اشیا کو دیکھتے ہیں - بعض اشخاص کو صحیح خواب

پڑتے ہیں اور بعض آنکھیں بند کر لینے سے عالم مثال کی چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ اور بعض کھلی آنکھوں سے اس عالم مثال کا معائنہ کرتے ہیں۔ چونکہ دنیا کا ہر ایک واقعہ پہلے عالم مثال میں گذر چکتا ہے۔ اس لئے چشم باطنی رکھنے والا شخص اس کو اس کے واقع ہونے سے پہلے ایک ہفتہ یا ایک ماہ یا ایک سال پیشتر ملاحظہ کر چکتا ہے۔ اور اس واقعہ آئندہ کی پوری تصویر اس کے سامنے آ جاتی ہے۔ وہ اس واقعہ کو یاد رکھ سکتا ہے۔ اور اس کی خبر دوسروں کو بھی دے سکتا ہے۔ اسی خبر کو ہم پیشین گوئی کہتے ہیں۔ جس سے لوگوں کو حیرت ہوتی ہے

چشم باطنی پیدا کرنے کے اکتساب

چشم باطنی کے پیدا کرنے کے لئے دو قسم کے مرکز یا چکر اجماع سے یا نمونے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک تو وہ چکر ہیں جو آلات حواس ظاہری سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور دوسرے وہ ہیں جو اعصاب ہمدردی یا سمپتھٹک نروس سے متعلق ہیں۔ ان چکروں کی ترقی کے لئے مختلف اشغال اور ریاضتیں بنائی گئی ہیں جنہیں ہم بہت جوگ کہتے ہیں۔ یہ جوگ نہایت ہی قدیم زمانہ سے ہم تک پہنچا ہے۔ بعض محققین کہتے ہیں کہ یہ اشغال اور اکتسابات قوم اطلاعات سے جو اس وقت مفقود ہے۔ آریا لوگوں کو پہنچے تھے اور جب قوم آریا ہندوستان میں آئی۔ تو وہ یہاں رائج ہوئے۔

اس وقت ہم کو اس تحقیقات سے مطلب نہیں کہ ابتدائی اشغال اور ریاضتیں کہاں سے آئی ہیں جنہیں ہٹ جوگ یا سخت بدنی ریاضات کہتے ہیں۔ مگر اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ ہندوستان میں ہزاروں برس سے یہ جوگ پایا جاتا ہے۔ اور لوگ اس کی تعلیم خفیہ یا سینہ بسینہ کرتے چلے آتے ہیں۔ اس جوگ سے عالم مثال کے اسفل طبقات کھل جاتے ہیں اور ہندوستان کے مرشدوں میں اس کا رواج بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ چونکہ ہندوستان کے اشخاص قدیم زمانہ سے یہ خصوصیت رکھتے ہیں کہ وہ کسی نئی اصلاح یا طریقہ کو بڑی مشکل سے سخت مزاحمت اور مخالفت کے بعد قبول کرتے ہیں اور جلد متغیر ہو جانے کی ان میں زیادہ قابلیت نہیں ہے۔ اس لئے وہ کسی ترقی یافتہ اشغال اور ریاضت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اور اسی پرانی لکیر کے فقیر ہیں جو ان کے آبا و اجداد سے چلی آتی ہے۔ اگر انہیں کوئی آسان طریقہ یا کوئی زیادہ مفید شغل یا ریاضت بتائی بھی جائے گی۔ تو وہ اس کو ہرگز قبول نہ کریں گے۔

قدیم زمانہ کی احتیاط

اگلے زمانہ میں پیر یا گرو علم باطن کے اشغال اور اسرار اپنے مریدوں اور چیلوں کو بتایا کرتے تھے اور ان کی نگرانی اور حفاظت میں مریدوں

اشغال کا اکتساب کرتے تھے۔ اس لئے انھیں ان اشغال باطنی سے کوئی مضرت پہنچنے نہ پاتی تھی۔ کیونکہ مریدوں کی تعلیم و تربیت میں از حد احتیاط عمل میں آتی تھی۔ اور مرید اپنے مرشدوں ہی کے پاس رہ کر عمل اور اکتساب کرتے تھے اور مرشد انھیں ہر مقام کو بحفاظت تمام طے کراتے جاتے تھے اور جو مشکلات واقع ہوتی تھیں ان میں رہنمائی کرتے اور ہر مسئلہ کی غلطی میں جو نا فہمیان واقع ہوتی تھیں انھیں سمجھاتے جاتے تھے اور راہ سلوک کی دشواری گزار گھاٹیوں میں اپنے مریدوں کے ہاوی اور رہبر ہوتے تھے۔ مگر آج کل یورپ اور امریکہ میں جہاں ہر شخص علم باطن اور اسرار غیب کا ولدا وہ ہے اس دور اندیشی اور اخفا پر عمل درآمد نہیں ہے وہاں تو یہ حال ہے کہ لوگ وکانون سے تصوف اور علم باطن کی کتابیں جن کے مصنف مشہور و معروف نہیں خرید لیتے ہیں اور ان کی تحریروں اور ہدایتوں پر عمل درآمد کرنے لگتے ہیں۔ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ایسے جلد باز اور خوش اعتقاد آدمیوں کو باطنی مضرت آید حال ہو جائے۔

ہر شغل اور ہر عمل ہر شخص کے لئے موزون اور مناسب نہیں۔ مرشد اور گرو کا یہ کام ہے کہ وہ اپنے مرید کی صحت جسمانی اور مزاج کے لحاظ سے کوئی شغل اس کے لئے انتخاب کرے۔ کیونکہ اگر اشغال اور مراقبات میں پوری احتیاط عمل میں نہ آئے گی۔ تو جسم اور دماغ کے

نازک اجزا اور باریک اعصاب کو بجائے فائدے کے نقصان پہنکا
 اس کے علاوہ ہندوستان کے اشخاص میں مدت ہائے
 دراز کے رسم و رواج نے ایک خاص قسم کی قوت اور قابلیت
 پیدا کر دی ہے اور ہند اور یورپ کے باشندے رسم و رواج
 اور اکل و شرب کے لحاظ سے بہت اختلاف رکھتے ہیں اور یہ
 فرق ان میں بطور وراثت طبعی کے چلا آتا ہے۔ ہزاروں برس سے
 ہندوؤں میں گوشت اور شراب کا رواج نہیں اور شریف قومیں مثلاً
 برہمن شراب اور گوشت کو مطلق استعمال نہیں کرتے۔ اہل اسلام
 میں بھی شراب کی سخت ممانعت ہے اور ہندوستان کے مسلمان
 عموماً گوشت کو بھی زیادہ استعمال نہیں کرتے۔ اور اکثر مرید اور
 سالکین راہ طریقت گوشت سے اجتناب کرتے ہیں۔ اس لئے
 ہندوستان کے اشخاص کو علم باطن کے اکتساب میں سہولت واقع
 ہوتی ہے اور انہیں کوئی جسمانی اور روحانی مضرت پہنچنے نہیں پاتی
 برخلاف اس کے یورپ اور امریکہ کے لوگ جو صد ہا برس سے
 صرف گوشت اور شراب ہی پر زندگی کا مدار سمجھتے ہیں اور جن کی
 عادتیں موروثی ہو چکی ہیں ان اشغال اور اکتساب میں بہت کچھ
 صعبیت اور دشواری محسوس کرتے ہیں اور ان اشغال کے اکتساب
 سے اکثر انہیں کوئی خاص مضرت پہنچ جاتی ہے۔ کیونکہ اکثر یہ اشغال
 ان اشخاص کے لئے خوف ناک ثابت ہوئے ہیں جو کھانے پینے میں

احتیاط نہیں کرتے۔ خراب اور گوشت حصول علم باطن کے لئے ایک بڑی سبب راہ ہے۔ یورپ اور امریکہ کے سالکین ان غذاؤں و زرا بھی اجتناب نہیں کرتے اور اس لئے وہ ان کثیر شخص ایسے پاؤں جاتے ہیں جن کے دماغ اور اعصاب کو ان اشغال کی وجہ سے نقصان ہوا ہے۔

بعض نقصانات یا مضرین

میرے ایک دوست انگریز نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ میں نے امریکہ میں لیکچر دینے کی غرض سے سیاحت اختیار کی تھی اور وہاں کے مالک کا اچھی طرح دورہ کیا تھا۔ اس سیاحت کے درمیان میں نے ۲۲ آدمیوں کو ایسا پایا جنہیں بے وقت عالم مثال کھلنے کی وجہ سے نقصان پہنچا تھا۔ ان اشخاص کا حال مختصر آئندہ فصل میں بیان کیا جائے گا۔

ان میں سے کئی اشخاص نے کتابوں میں پڑھ کر حبس دم کا شغل اختیار کیا تھا اور اپنے شخص اور دماغ پر اس قدر زیادہ زور ڈالا تھا کہ ان کے شش اور دیگر اعضائے جسم کی باریک رگوں اور اعصاب کو صدمہ پہنچا تھا۔ اور امراض سینہ اور شش میں مبتلا ہو گئے تھے۔

بعض اشخاص نے اعصاب اور دماغ پر زیادہ زور ڈالنے سے

اپنی صحت جسمانی کو خراب کر لیا تھا۔ اور بعض تو خرابی و مایوسگی کی وجہ سے پاگل خانہ دار المجانین میں قیام رکھتے تھے۔

بعض اشخاص کے دماغ نرم پڑ گئے تھے اور ان کی دماغی ساخت اور اجزاء میں شکستگی اور خلل واقع ہوا تھا۔

بعض اشخاص کے عصبی مرکزون اور چکرون میں خلل آگیا تھا اور ان کے اس سنہرے جال میں نقصان وار ہوا تھا جس کا ذکر ہم کسی پچھلی فصل میں کر آئے ہیں اور ان مرکزون کی خرابی سے انہیں مختلف اشکال ہر وقت دکھائی دیتے تھے۔

ان متذکرہ بالا اشخاص کے دیکھنے سے ہر شخص کو افسوس آتا ہے

جنہوں نے اپنی جلد بازی سے بغیر سرپرستی کسی مرشد کامل کے اس

داوی سلوک میں قدم رکھا تھا۔ چنانچہ اسی مضمون کو حضرت مولوی

معنوی نے اپنی مثنوی میں ان اشعار کے ذریعہ سے بیان فرمایا ہے

اندرین وادی مرو بے این دلیل لا احب الاقلین گو چون غلیل

روز سایہ آفتابے را بیاب دامن شہ شمس تبریزی تباب

رہ ندانی جانب این سور و عرس از ضیاء الحق حسام الدین بہر سر

خلاصہ مطلب ان اشعار کا یہ ہے کہ اس وادی میں بغیر مرشد

کامل کے قدم نہ رکھو۔ کسی شمس الدین تبریزی یعنی اپنے زمانہ کے

پیر کامل کو تلاش کرو اور اس کا دامن پکڑو۔ اگر کوئی مرشد کامل بالفعل

نہ ملے تو کسی مشہور و معروف پیر یا مرشد کے ہاتھ پر بیعت کر لو

راہ سے کسی قدر واقف ہوا اور جو معمولی طور سے راہ سلوک کی
 منازل کو طے کرا سکے۔ اگر یہ لوگ راہ سلوک کو کسی مرشد کی
 نگرانی میں رہ کر طے کرتے اور جلد بازی اور زور و رمی کو کام میں
 نہ لاتے اور قرآن شریف کے اس فقرہ پر کہ را بطوا و صابروا یعنی
 اکتساب کرتے رہو اور جلدی نہ کرو پر عمل پیرا ہوتے تو کبھی یہ خرابیاں
 پیدا نہ ہوتیں۔ اور عالم مثال کے اعلیٰ طبقات ان پر کھل جاتے اور
 دنیا میں وہ نہایت ہی آسودہ اور خوش حال اشخاص ہوتے۔ اور
 اپنی زندگی نہایت ہی آرام و راحت سے گزارتے۔ اور اس بے
 چینی اور خرابی سے محفوظ رہتے جو انہیں بے جا اور بے ضابطہ عمل
 و اکتساب سے لاحق ہوئی ہے اس کے علاوہ ہٹ جوگ کے
 استعمال سے صرف وہی قوتیں ترقی پاتی ہیں جو اس مادی و مین
 کام آتی ہیں اور مرنے کے بعد وہ قوتیں بالکل بے کار ہو جاتی ہیں
 برخلاف راج جوگ یا اعلیٰ درجہ کے سلوک سے اعلیٰ درجہ کی باطنی
 قوتیں ترقی کرتی ہیں۔ اور بعد موت بھی ان کی ترقی زائل نہیں ہوتی
 اسی مقام کے مناسب کسی شخص نے کیا خوب کہا ہے کہ دانائی
 آئندہ کی سچتہ عمارت کو تیار کرتی ہے۔ اور نادانی ریت پر گھر بناتی
 ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اکتساب روحانی میں جلدی نہیں کرنی
 چاہیے چنانچہ سعدی صاحب فرماتے ہیں۔ شعر
 تصور و آئینہ دل کنی صفائی بتدریج حاصل کنی

فصل ۷۔ چشم باطنی پیدا کرنے کے ابتدائی طریقے

تعطل حواس ظاہری و باطنی

غیر مری دنیا یا عالم مثال کے سرچ اور نازک حرکات کو محسوس کرنے کے لئے جو ہمارے چاروں طرف فضا میں بھرا ہوا ہے یہ ضرور ہے کہ ہم اس دنیا کی آوازوں سے اپنے کانوں کو بند کرنا اور اس کے مناظر سے اپنی نظر کو روکنا سیکھیں۔ جب تک یہ پُر شور آوازیں ہمارے کانوں میں آتی رہیں گی اور جب تک ہماری آنکھیں اس دنیا کے مختلف رنگا میزوں کو دیکھتی رہیں گی۔ اس وقت تک عالم مثال کی نازک آوازیں ہمیں سنائی نہ دینگیں اور نہ ہم اس کے نہایت ہی خوشنما منظروں کے نظارے سے دل کو خوش کر سکیں گے۔ بازاروں کے شور و غل میں نازک باجوں کی وہ بھی آوازیں کہان سنائی دیتی ہیں۔ جب کسی مقام پر پہنچنا چاہتا ہے جس میں مختلف قسم کے باجے ایک ساتھ آواز دیتے ہیں تو اس مرکب آواز میں سے کسی ایک باجے کی آواز کی شناخت کرنا تربیت یافتہ کا دل ہی کا کام ہے۔ دن کو تارے تو آسمان پر بدستور سابق موجود ہوتے ہیں۔ مگر آفتاب کی شدید روشنی میں انھیں کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ لیکن جب سورج غروب ہو جاتا ہے۔ تو اس وقت بے انتہا تارے

دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اسی طرح جب حواس ظاہری اور باطنی کا معطل کر دینا مشق اور اکتساب سے حاصل نہ کیا جائے گا۔ عالم مثال ہرگز نہ کھلے گا۔

اگر ہم اپنے جسم کو ساکن کرنے اور حواس ظاہری اور حدیث نفس کو معطل کر دینے کی قوت حاصل کر لیں گے تو اس عالم ناستوت یا مادی سے غافل ہو جانے کی حالت اختیار ہی بہین نصیب ہو جائی گی۔ جس کو ہم حالت نوزم اور یقظہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

یہ غفلت کئی طرح سے لوگ حاصل کرتے ہیں۔ میمریزم کے پاسون (ہاتھ پیرنا) اور ہینا نزم کے احکام سے یہ حالت غفلت پیدا ہوتی ہے۔ یعنی جب کسی معمول کے جسم پر کوئی میمریزم جانیوالا شخص ہاتھ پیرتا ہے یا ہینا نزم کا عامل کسی پر کوئی حکم کرتا ہے۔ تو معمول غفلت کی حالت میں آجاتا ہے۔ بعض اشخاص نشی اور عصبانیت کو سن کرنے والی چیزوں کے استعمال سے غفلت پیدا کرتے ہیں مثلاً گانجے چرس۔ شراب بھنگ وغیرہ کے استعمال سے غفلت پیدا کی جاتی ہے۔ بعض اشخاص ایسی چیزوں کی دھونے اور بخار لینے سے اپنے دماغ کو معطل کرتے ہیں جن سے اعصاب سست ہو جاتے ہیں۔ بعض درویش گھومنے اور چکر پھرنے سے جو ایک قسم کی گردش و دوری ہے اپنے دماغ کو معطل کر لیتے ہیں اور اس تدبیر سے ان میں غفلت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ عالم مثال کی

اشیا کو دیکھنے لگتے ہیں۔ بعض مرشدوں کو میں نے پچشم خود دیکھا ہے کہ جب سمع میں ناہمین حال آتا ہے۔ تو وہ گردش دوری کرتے ہیں اور بے ہوش ہو کر گر پڑتے ہیں اور ان کا دماغ اور اعصاب بالکل معطل ہو جاتا ہے۔ غرضکہ مختلف تدبیریں غفلت یا نوم یقظہ کی حالت پیدا کرنے کے لئے ہندوستان میں رائج ہیں۔

حبس دم یا سانس روکنا

اس غفلت کو پیدا کرنے کے لئے ممالک مشرقی میں سب سے زیادہ رواج حبس دم کا ہے۔ جس کو پرانا کہتے ہیں اور اس شغل سے اب اکثر اہل مغرب بھی بخوبی واقف ہو گئے ہیں۔ حبس دم کا طریقہ یہ ہے کہ سالک کسی اسن یا نشست خاص سے بیٹھتا ہے۔ اور اپنی سانس کو ایک وقت میں تک روک کر آہستہ آہستہ چھوڑتا ہے۔ بعض اشخاص ایک نٹھنے سے سانس لیتے اور دوسرے سے چھوڑتے ہیں اور بعض اپنے خیال میں کسی خاص حصہ جسم میں سانس کو ٹھراتے ہیں۔ مثلاً کوئی سانس کھینچ کر دماغ میں روکتا ہے اور کوئی قلب میں اور کوئی ناف میں غرضکہ حبس دم کا عمل تو نہایت ہی سیدھا سادہا ہے۔ مگر لوگوں نے اپنے ذہن سے اس کے صد ہا طریقے نکالے ہیں اور مختلف پیرو مرشد مختلف طرز سے سانس روکنا اور چھوڑنا بتاتے ہیں۔ اس پر

اہل ہند نے آسن اور شست میں بھی کچھ پُرش و خراش کی ہے۔ اور
اس قدر مختلف آسنوں اور شستوں کا رواج ہے۔ جن کے بیان
کرنے کا اس وقت موقع و محل نہیں ہے۔

حبس دم کا اصلی مقصد

ہندوستان کے اگلے بزرگوں اور مہاتماؤں نے جو یہ حبس دم
کے اشغال ایجاد کئے تھے۔ تو ان سے ان کی خاص غایات اور
مقاصد تھے۔ استقرا اور تتبع سے صرف یہی تین مقاصد پائے
جاتے ہیں۔ جن کا ذکر ہم یہاں کرتے ہیں۔ (۱) خیالات یا حدیث
نفس کا روک دینا۔ (۲) وماغ کا بے حس و حرکت کرنا۔ (۳) جسم
میں ایٹھصر کے موج کو زیادہ کرنا اور اس کی لہروں کو اعضائے جسم
میں زیادہ داخل کرنا۔ ان تین اجمالی مقاصد کو ہم پھر ذرا تفصیل کے
ساتھ حسب ذیل ورج کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔

(۱) قدیم زمانہ میں یہ بات مشاہدہ کی گئی تھی کہ جب کوئی شخص
کسی خیال یا سوچ بچار میں مستغرق ہوتا ہے۔ تو اس کی سانس
کی حرکت بتدریج کم ہو جاتی ہے۔ اور کبھی کبھی انتہائے استغراق
خیال میں تنفس موقوف بھی ہو جاتا ہے۔ جب تجربہ سے یہ بات
معلوم ہوئی کہ گہرے تفکر کے وقت سانس کم ہو جاتی یا رک جاتی ہے
تو اس پر یہ اصول قائم کیا گیا کہ اگر سانس روکی جائے گی تو خیالات

کم ہو جائیں گے یا بالکل بند ہو جائیں گے۔ اس لئے حدیث نفس اور منتشر خیالات کے دور کرنے یا یک سوئی پیدا کرنے کے لئے جسکے کا طریقہ نہایت ہی مستحسن اور مفید سمجھا گیا ہے۔ اور ایک حد تک یہ قیاس صحیح ثابت ہوا ہے کیونکہ جسم اور ذلی میں مناسبت اور ہمدردی پائی جاتی ہے۔ اور ایک کی حالت کا اثر دوسرے پر پڑتا ہے۔

(۲) ہندوستان کے اکثر رویش اور مرشد جنھوں نے برسوں حبس و م کی مشق کی ہے اس قدر عرصہ تک سانس کو روک سکتے ہیں جس کے بیان سے لوگوں کو تعجب ہو گا اور وہ بڑی مشکل سے اس بیان کو باور کریں گے خون ہمیشہ گردش کرتا ہے اور ہر سانس کے ساتھ کاربن تو باہر آتی ہے اور آکسیجن اندر جاتی ہے۔ جب دم روکا جاتا تو خون میں کاربن بہت جمع ہو جاتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حبس دم سے دماغ بے حس ہونے لگتا ہے اور ایک غفلت کی حالت پیدا ہوتی ہے۔

(۳) جب حبس دم کی مشق سے سانس کا روکنا اور چھوڑنا بآسانی اور موقت ہو جاتا ہے۔ تو اس وقت جو کچھ ایتھر جسم کے اطراف بھرا ہوتا ہے۔ اس کی وائٹل فورس یعنی قوت حیات میں زیادہ حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کا دوران بہت سریع اور تیز ہو جاتا ہے اور جب یہ تصور کیا جاتا ہے کہ سانس مقامات مخصوص سے آتی اور جاتی ہے تو اس وقت کوئی واقعہ سانس ان مقاموں سے

نہ آتی اور نہ جاتی ہے۔ مگر بیتصر کی لہریں ان مقامات میں البتہ تیز اور سرریح ہو جاتی ہیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اعصاب کے بعض مرکز ترقی کرنے لگتے ہیں اور عالم مثال کھل جاتا ہے۔

حبس دم کے نتائج

جب اعصاب کے یہ خاص خاص مرکز یا چکر حبس دم سے منور اور ترقی پا جاتے ہیں۔ تو اس وقت عالم مثال کھل جاتا ہے اور غیب کے مناظر اور تماشے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اس وقت مبتدی کی قوت سے یہ بات باہر ہو جاتی ہے کہ وہ ان غیبی مناظر کے دیکھنے سے چشم پوشی کر سکے یا غیبی آوازون کے سننے سے کان بند کرے۔ یہ دونوں باتیں اس کے امکان سے خارج ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ مناظر اور آوازیں اچھی اور دلچسپ ہوں گی۔ تو انکے دیکھنے سے دل کو لطف اور سرور حاصل ہو گا۔ اور اگر بد قسمتی سے یہ مناظر خراب اور تکلیف دہ ہوں گے۔ اور یہ آوازیں بھاری اور غمناک ہوں گی۔ تو ان کے سننے سے دل کو نفرت معلوم ہوگی ابتدا میں اکثر عالم مثال کے اسفل طبقے کھل جاتے ہیں۔ اور ان میں بھی ناقابل نفرت سمین نظر آتے ہیں اور گالی گلوچ کی آوازیں اور غمناک صدائیں سنائی دیتی ہیں۔ اور ان طبقات کے کھل جانے کی صورت میں مبتدی کو ان مناظر سے گریز مشکل

ہوتی ہے۔

عموماً لوگوں کی ساری توجہ اعضائے جسم کی ترقی اور نمو کی طرف مائل رہتی ہے۔ اور ان کے قوائے عقلی اور فکری کافی طور سے نمو نہیں کرتے۔ اور وہ قوائے نفسانی اور شیطانی کے دام میں گرفتار ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر جب وقتاً عالم مثال کے طبقات اسفل کھل جاتے ہیں۔ تو وہ ان کے اثر سے بہت متاثر ہوتے ہیں اور اس کے عوض کہ وہ ان طبقات اسفل کی اشیاء پر حکمران اور قادر ہوں وہ خود ان کے قابو اور حکومت میں آجاتے ہیں۔ اس لئے عالم مثال کے کھولنے سے پہلے مبتدی کو چاہئے کہ وہ اتقا اور پرہیزگاری حاصل کر لے اور اپنے قوائے عقلی اور فکری کو تعلیم و تربیت سے ترقی دے۔ ورنہ وہ کبھی عالم مثال کی اشیاء پر حاکم نہ ہو گا۔ بلکہ بالعکس ان کا ماتحت ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مرشد کامل عالم مثال کے فتنل اکثر انہیں انتہائی کم بتاتے ہیں جنہیں کسی قدر استعداد علمی ہوتی ہے۔ اور جو علوم مرشد اور اخلاق میں علمی اور عملی دونوں طرح کی لیاقت رکھتے ہیں۔ ہماری نزدیک جاہلون اور نادانانہ انتہا جس کو اول ہی مرتبہ ایسے اشغال بتانا نہیں چاہئے جن سے عالم مثال کھل جاتا ہے۔ سب سے پہلے انہیں اخلاق اور نفس کشی کی تعلیم دینی چاہیے۔ سلوک کے طریقوں میں جلدی اچھی نہیں۔ ہیغہ مرید کی علمی اور ذہنی قابلیت کا اندازہ

کر لینا ضرور ہے۔

جس دم عموماً سب کے لئے مفید ہے کیونکہ اس سے انسان کے قوائے جسمانی میں جان ترقی کرتی ہے۔ مگر عوام الناس کو اس جس دم کی تعلیم ضروری نہیں جو سالکین کے لئے مخصوص ہے۔ عوام کو جس دم کا وہ طریقہ بتانا چاہئے جو عام طور سے ہمیشہ میں کھارڈا اور جسمانی کثرتوں کے مقاموں میں بتایا جاتا ہے۔ اس طریقے سے سب کی صحت جسمانی کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اور اس جس دم سے نہ تو عالم مثال کے طبقات اسفل کھلتے ہیں اور نہ کوئی صدمہ پیش اور سینہ کو پہنچتا ہے۔

خیال کو شمسی مرکز یا چکر پر چمانا

عالم مثال کے کھولنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اعصاب کے اس مرکز یا چکر پر نظر باطنی یا خیال جمایا جاتا ہے جسکو شمسی مرکز کہتے ہیں اعصاب ہمدردی کے اس مرکز کو دوسرا دماغ بھی کہتے ہیں اور اس کے دوسرے نام بھی ہیں۔ اس مرکز کو ابھارنے کے لئے بہت سے طریقے ایسا دئے گئے ہیں۔ جن کی تعریفوں میں بے فائدہ اور اقساہ کئے جاتے ہیں۔ یہ بڑی نادانی کی بات ہے کہ اکثر اشخاص اُن باتوں پر بغیر سوچے سمجھے عمل کرنے لگتے ہیں۔ جنکا اثر ان کے جسم اور دماغ پر پڑتا ہے۔ عقل کی بات تو یہ ہے کہ پہلے

کسی کام کے مال کار اور اس کی خاصیت کو دریافت کر لیا جائے۔ جب اس میں ہاتھ ڈالا جائے۔ اکثر بے علمی اور نادانقنیت سے نقصان پہنچ جاتا ہے۔

جب کوئی مبتدی اپنی توجہ یا خیال کو مرکز شمسی پر جاتا ہے۔ اور اس کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا فعل ترقی کرے۔ تو اس کے قلب سے ایک حرکت نکل کر جس کو وائٹل فورس کہتے ہیں تیزی کے ساتھ اس مرکز کی طرف جاتی ہے۔ اور یہ نمودار زور دار ہوتا ہے بعض اوقات اس مثالی مرکز میں جو اس عصبی مرکز کے ساتھ تعلق رکھتا ہے ایک تحریک پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس مبتدی کو عالم مثال کے طبقات اسفل کا کچھ مشاہدہ ہونے لگتا ہے۔ یعنی کچھ اجمالی شکلیں اور رسمیں اسے دکھائی دینے لگتے ہیں جنہیں وہ سمجھ نہیں سکتا۔

ایسی صورتوں میں عموماً وائٹل فورس یا قوت جان اس مرکز میں بکثرت جمع ہو جاتی ہے جس سے مبتدی کے جسم کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ یہ شمسی مرکز جس پر خیال جمایا جاتا ہے ایک نہایت ہی قابل احتیاط مرکز ہے۔ اس کا تعلق اعضائے باطن سے ہے جب اس مرکز پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ تو قوت باطن خراب ہو جاتی ہے۔ اور بعض اوقات گردن کے افعال میں خلل پڑ جاتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے

جب کوئی معمولی آدمی جو علم تشریح جسم سے ناواقف ہے اس مرکز شمس پر خیال جاکر اور اعضاء جسمانی پر بھی توجہ کرتا ہے۔ اس کارروائی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس کے اعضاء ہاضمہ کے ساتھ اس کے تمام اعصاب میں بھی خرابی اور بے ترتیبی لاحق ہوتی ہے جب اس طرح نظام عصبی میں بے جا مداخلت واقع ہوتی ہے اور اس کے غیر ارادی اور طبعی افعال میں خواہ مخواہ دست اندازی کی جاتی ہے۔ تو اس وقت جسم میں ناقابل علاج امراض عصبی پیدا ہو جاتے ہیں جن سے دل میں ایک قسم کی سخت مایوسی اور اوداسی لاحق ہوتی ہے۔ جب ان خوفناک اشغال پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ تو اس کا نتیجہ بعض وقت یہ ہوتا ہے کہ جسم کا کوئی حصہ مفلوج اور بے حس و حرکت ہو جاتا ہے۔

ایک سفید یا سیاہ داغ پر یا کسی مبل لٹویا آئینہ پر نظر جانا

تیسرا طریقہ عالم مثال کے کھولنے کا یہ ہے کہ ایک سیاہ داغ پر جو کاغذ یا دیوار پر بنایا جاتا ہے یا ایک سفید داغ پر جس کے اطراف سیاہی پھیری جاتی ہے یا ایک شفاف گولے یا آئینہ پر جو سامنے کہا ہوتا ہے نظر جاتے ہیں۔ اور اس کو پلک مارنے کے بغیر گھورتے رہتے ہیں۔ اس فنل سے دو مقصد ہیں۔ ایک تو یہ کہ افعال ہواغ معطل ہو جائیں یا ورنوم و یقظہ کی حالت یعنی ایک قسم کی نیم غفلت

پیدا ہو۔ دوسرے یہ کہ آنکھوں کے اعصاب کے ذریعہ سے ان مرکزوں میں تحریک اور نمو پیدا ہو جو عالم مثال سے تعلق رکھتے ہیں اور اس طرح ایک عارضی نظر باطنی حاصل کی جائے جس سے عالم مثال کی دید نصیب ہو۔

جب کوئی مبتدی ایک سفید داغ کو آنکھ جھا کر گھورنا شروع کرتا ہے اور دیکھنے کے درمیان میں پلک نہیں مارتا تو آنکھوں کی پتلی کے اجزایا ایٹینا سیلز پر بار پڑتا ہے اور ان میں سخت تھکاوٹ اور پستی واقع ہوتی ہے جسکی علامت آنکھوں کی سرخی اور ادون میں پانی نکلتا ہے۔ اور جب اس داغ کو دیر تک گھورتے ہیں۔ تو وہ نظر سے غائب ہو جاتا ہے۔ یہ سفید داغ جو دیکھائی نہیں دیتا۔ تو اسکا اصلی سبب یہ ہے کہ آنکھ کی پتلی یا مردم چشم بے حس ہو جاتی ہے جب ایک مدت دراز تک یہ عمل کیا جاتا ہے۔ تو اعصاب چشم خمبین ایٹک فرس کہتے ہیں سست اور بے حس ہو جاتے ہیں۔ اور آخر کار نظر میں کسی قدر فتور آ جاتا ہے۔ جب یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو دماغ میں غفلت لاحق ہوتی ہے۔ اور وہ خارجی اشیا کو محسوس نہیں کرتا ہے۔ اس حالت غفلت میں بعض اوقات خواب کی حالت لاحق ہوتی ہے اور اس کو بعض مناظر غیبی نظر آتے ہیں مگر اس شغل سے اکثر اوقات کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ اس شغل سے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں مرکز بینائی کو

تحریک ہوتی ہے جس کا اثر مرکز مثالی تک پہنچتا ہے اور پھر عالم مثال کے اثرات و ماغ میں منتقل ہوتے ہیں جن سے اس عالم غیر مری کے اشکال و کہانی و سینے لگتے ہیں۔ مگر جو چیزیں اس شغل سے بعض اوقات و کہانی دیتی ہیں۔ وہ بالکل ناقابل اعتبار ہیں۔ کیونکہ جن اعضا کے وسیلہ سے یہ اشکال ہم تک آتے ہیں وہ اس کام کے لائق نہیں۔

اس قسم کے اشغال اس قابل نہیں ہیں جنکی رغبت عوام کو دلائی جائے۔ کیونکہ ان کی وجہ سے دماغ ہمیشہ کے لئے سست اور پست ہو جاتا ہے۔ اور اس کے اعصاب میں ایک قسم کی بے حسی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ان اشغال سے آنکھوں پر بھی بار پڑتا ہے جو خوفناک ہے۔ ممکن ہے کہ ان اشغال کے پریکٹس اور عمل سے ایک عرصہ کے بعد فتور بنیائی پیدا ہو اور آنکھوں کی بصارت زایل ہو جائے۔ اور اکثر تو یہی دیکھا گیا ہے کہ ان اشغال سے نظر میں ضعف اور کوئی نہ کوئی فتور واقع ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات احوالی اور ترجہا پن بھی اس پیدا ہوتا ہے۔

اشغال بے فائدہ

ہم بیان کر چکے ہیں کہ ان اشغال سے جو صرف دماغ ہی پر اثر

ڈالکر کچھ بین النوم و یقظہ کی حالت پیدا کر دیتے ہیں کوئی زیادہ روحانی فائدے حاصل نہیں ہوتے۔ مراقبہ میں بھی سونے کی حالت کی طرح آدمی کی روح اس مادی جسم سے باہر چلی جاتی ہے۔ اور اس کی آگاہی یا توجہ عالم مثال کی طرف ہو جاتی ہے اگر اہل مراقبہ اس غیر مرئی دنیا میں بیدار یا آگاہ ہیں اور وہ ان وہ کام کرتے ہیں تو البتہ وہ کچھ مفید معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ اور مراقبہ سے فارغ ہونے کے بعد خواب کی طرح ان واقعات کو یاد بھی رکھتے ہیں۔ ورنہ جیسے حالت بیداری میں کسی چیز کو نہیں جانتے اسی طرح اس عالم مثال میں پہنچ کر کوئی کارآمد بات نہیں سیکھتے۔

اگر وہ شخص جس کی رسائی عالم مثال تک ہوئی ہے کوئی ایسا آدمی ہے جس کے قوائے دماغی یا عقلی میں ترقی نہیں ہوئی۔ یا ایک جاہل یا ناخواندہ شخص ہے جسکی توجہ ہمیشہ اسی مادی دنیا اور جسم طبعی کی طرف مایل رہی ہے۔ تو ایسی صورت میں جب وہ مراقبہ کرتا ہے اور اس پر اس عالم ناسوت سے غفلت کی حالت طاری ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے قالب مثالی کے ساتھ عالم مثال میں داخل ہوتا ہے۔ تو وہ ان بھی وہ اوپر اوپر مارا ہوا پھرتا ہے اور کسی شے کو دیکھ کر اس کی شناخت نہیں کرتا اور کوئی مفید بات اس سے حاصل نہیں کرتا۔ جس طرح ایک گنوار اور جاہل آدمی شہر میں ذکر

تمام چیزوں کو حیوانات کی طرح اجمالاً دیکھتا ہے اور ان اشیاء کی حقیقت اور خاصیت سے بے خبر رہتا ہے۔ اسی طرح سے ایک جاہل صوفی بھی مراقبہ کے ذریعہ سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا۔ وہ عالم مثال کے مناظر اور اشکال کو اسی طرح اپنے مراقبہ میں دیکھتا ہے جس طرح کہ ایک مہمولى آدمی خواب دیکھتا ہے۔ عالم مثال سے واپس آنے یا مراقبہ سے بیدار ہونے کے بعد بھی ہمیں وہی اور اک و آگاہی یا عقل و تمیز رہتی ہے جو اس سے پہلے تھی۔ ان واقعات سے صاف واضح ہے کہ اس ابتدائی انکشاف عالم مثال سے کوئی فائدہ نہیں۔ اور اس لئے ان اشغال کے اکتساب سے زیادہ کوئی نفع نہیں جنہیں ہم اد پر بیان کر آئے ہیں۔ آج کل یورپ اور امریکہ میں اسی قسم کے صدہا اشغال کتابوں میں درج کئے جاتے ہیں۔ اور ان کی تعریفوں کے لبو چوڑے اشتہارات اخباروں میں دیکھے جاتے ہیں۔ اور بڑی بڑی فصاحت و بلاغت سے ان کی طرف لوگ رغبتیں دلاتے ہیں۔ مگر جب ہم ان اشغال اور اکتساب کے بے فائدہ ہونے پر اور ان کے خطرات اور نقصانات پر ایک گہری نظر ڈالتے اور ان کے بُرے نتائج پر غور کرتے ہیں جو غلغلی اور اداسی اور مایوسی کی شکل میں پیدا ہوتے ہیں جو ان کے عاملوں کے آید حال ہوتی ہے۔ تو ہمیں یہ کہہ دینا ضرور ہے کہ ان اشغال سے کچھ فائدہ نہیں اور کوہکنڈ

اور گاہ برآوردن کی مثل صادق آتی ہے۔

فصل ۸۔ عالم مثال کو اعلیٰ طبقات کی دید

سچے سالکین کا طریقہ

اب تک ہم نے ان اشغال کا ذکر کیا ہے جن کے اکتساب و باغ میں عالم مثال کی تھریکون کے اصول کرنے یعنی ان سے متاثر ہونے کی کسقدر صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ اور وماغ اور اعصاب کے بے حس ہو جانے سے عالم مثال کے طبقات اونڈی کھل جاتے ہیں۔ مگر جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں ان اشغال سے فائدے بہت کم ہیں اور ان میں خوف و خطر زیادہ ہیں۔ اور اگر زیادہ ان اشغال میں قباحت یہ ہے کہ ان سے قرآن و وحانی کوئی بڑا فائدہ نہیں پہنچتا۔ اور وہ ان اکتساب میں شدید مکتبین اٹھانے کے بعد بھی ناتربیت یا غم اور بے ترقی یا فتنہ رہتے ہیں۔ اگرچہ ان اشغال کے اکتساب سے کسقدر عالم مثال کھل جاتا ہے۔ تاہم آدمی بلحاظ فہم و فراست اور اخلاق و عادات سے جیسا تھا ویسا ہی رہتا ہے۔ بلکہ اس کے خلاف بعض اوقات اس کے فہم اور عقل میں کمی اور نقصان واقع ہوتا ہے اور اس کے اخلاق و عادات پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو جاتے ہیں کیونکہ

عالم مثال کے اسفل طبقات میں داخل ہونے سے اوس پردہان کے کم درجہ اور بد باطن اشخاص کے دلون کے اثرات بد پڑتے ہیں جن سے وہ بچ نہیں سکتا۔

پکے عاشقان حق اور سچے سالکین طریقت اس بات کو خوب جانتے ہیں کہ راہ سلوک کا دور و دراز راستہ و حقیقت سے چھوٹا راستہ ہے۔ وہ اس راستہ میں کسی تکلیف و محنت سے گریز نہیں کرتے۔ وہ برسوں شوق و ذوق سے صبر استقلال کے ساتھ ریاضت اور مجاہدات نفس میں مشغول رہتے ہیں۔ وہ اپنی کامیابی کے مقابلہ میں عمر نوح کو بھی ناچیز جانتے ہیں۔ ان کے دلون میں بھی خواہش ہوتی ہے کہ ہم ابد الابد تک بھی اپنے اشغال قائم رکھیں اور انھیں میں ان کو مزملتا ہے۔

ایک مدت دراز کے مجاہدے اور ریاضت کے بعد سالکین کو اپنی ذات کا علم یا عرفان حاصل ہوتا ہے اور فنا فی اللہ کا اعلیٰ مقام پانے کے بعد جو انسانی ترقی کی سوانح انتہائی ہے۔ وہ اپنی آپ کو پہچانتے ہیں۔ جب اس کو خود شناسی نصیب ہوتی ہے تو وہ خود بالقصد مجاہدے اور اکتساب کے ذریعہ سے اپنی خود غرضی۔ ذاتی شخص اور اغراض نفسانی سے باز آتا ہے اور غیریت کو یک لخت چھوڑ دیتا ہے۔ اور اپنی ہر جسمانی اور روحانی قوت کو ان اشخاص کی امداد کے لئے وقف کر دیتا ہے جو اس کا خانہ عالم کی

ترقی اور بہبودی کے لئے کام کر رہے ہیں۔ یعنی وہ جو کچھ کام کرتا ہے وہ خالصہً للہ مخلوق کی نفع رسانی کے لئے کرتا ہے اور اپنی ذاتی اغراض کو اس میں ذرا بھی دخل نہیں دیتا۔

اس انتہائی معراج خود شناسی پر پہنچنے کے لئے جو مال کار انسانیت ہے یہ ضرور ہے کہ انسان اپنے اخلاق و عادات کو درست کرنے اور سخت مجاہدے اور ریاضت کے ذریعہ سے نفس کے ہلکات سے بچے اور فضائل نفس الکتاب کرے اپنی احساس و خیالات کو آراستہ کرے۔ اور تزکیہ۔ تجلیہ اور تصفیہ سے قلب و روح کی صفائی حاصل کرے۔ جو لوگ اپنے ہم جہتوں کے قوائے روحانی کی ترقی میں ساعی ہیں اور جنہیں اون کی خدمت اور ہدایت سے استعداد خوشی ہوتی ہے۔

کہ وہ اپنی خوشی ترقی روحانی اور منفعت ذاتی کو بھول جاتے ہیں۔ وہ واقعی راہ سلوک کے اعلیٰ منزلوں پر پہنچے ہوئے ہیں جہاں پر ان قوتوں کا ظہور آسان ہے جن کے ابھار اور نمو سے عالم مثال یا ملکوت دکھائی دیتا ہے یعنی خود غرضی کے چھوڑ دینے اور دوسروں کی خدمت بغیر کسی مزد اور صلہ کے کرنے سے سالکین طریقت کو عالم مثال کے اعلیٰ طبقات بہت جلد اور باسانی کھل جاتے ہیں بھی اہل اللہ جو خالصہً خدا یا خلق کی خدمت پر ہمہ تن مصروف ہیں ہر زمانہ میں یعنی نوع انسان کی ترقی کے نمونے ہوئے ہیں۔ اور

انہیں کی پیروی سے لوگ آئندہ بھی ترقی کر سکتے ہیں۔ جن قوموں میں ایسے اشخاص کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے وہ دراصل روحانیت میں ترقی کرتی ہے اور جن میں یہ لوگ مفقود ہوتے ہیں وہ نفس کے مہلکات میں گرفتار ہوتی ہے اور رغاد نگہبست اولیٰ میں گر جاتی ہے۔

مدارج ترقی کو جلدی حاصل کرنا

ساکین ترقی انسانی کے منازل اور مدارج کو جلدی طے کرنا چاہتے ہیں۔ اور مدارج ترقی پر پھنسنے کے لئے سخت محنت اور مشقت کا بار اٹھاتے ہیں اور عوام الناس نہایت ہی آہستہ رفتار کے ساتھ ہزاروں برسوں کے عرصہ میں ان گھاٹیوں کو طے کرتے ہیں۔ عوام الناس میں عالم مثال کے دیکھنے کے لئے وہ نظردت و راز میں خود بخود پیدا ہو جائے گی جس سے اس عالم غیر مری کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس مدت مدید کے بعد ان کے دماغ بھی اس حد تک ترقی کر جائیں گے کہ ان تک وسیع تر عالموں کی تحریک پھنسنے لگے گی اس زمانہ میں ان عوام الناس کے دماغ اس تحریک سے بالکل بے حس ہیں۔ جب ان کے دماغوں میں اس تحریک کے قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔ تو ان پر عالم مثال حمل جائیگا۔ جو ہمارے اندر اور اطراف و جوانب اس وقت موجود ہے۔ اس زمانہ میں بھی اکثر بچے ایسے پیدا ہوتے ہیں جن پر چھ سلت سال

تک عالم مثال کھلا رہتا ہے اور اس عمر کے بعد والدین کی بے احتیاطی اور جہالت کی وجہ سے جو ان کی تربیت و تعلیم میں واقع ہوتی ہے یہ نایاب قوت ضائع ہو جاتی ہے۔

کسی معین اور مقررہ طریقہ سے جو اس میں ترانے گئے ہیں یہ ضرور نہیں کہ سالک پر عالم مثال کھل جائے۔ بلکہ اس عالم غیر مری کی دید کے لئے یہ لازمی ہے کہ قوائے دماغی اور عصبی میں ترقی پیدا ہو۔ اور دماغی ترقی کے لئے ضرور ہے کہ کسی طرز عمل یا اکتساب سے احساس قلب اور ارادے کی قوتوں میں نمو اور زور پیدا کیا جائے۔ ان روحانی قوتوں کی ترقی کا عام اصول تو یہی ہے کہ ان کا اکتساب اور مشق عمل میں آئے۔ مگر کسی خاص شغل اور طرز عمل کی کوئی خصوصیت ہو نہیں سکتی۔ ان اندرونی قوتوں کی ترقی سے دماغ اور اعصاب کی ترقی لازمی امر ہے۔ اور چونکہ نوع انسان ہزاروں برسوں سے قوائے روحانی کا اکتساب کر رہی ہے اور اس میں یکے بعد دیگرے اخلاق و عادات شریفہ قائم ہوتے جاتے ہیں۔ اس لئے ان کے دماغوں میں بھی تدریجی ترقی ہوتی جاتی ہے اور دماغ اور اعصاب میں عالم مثال کے دیکھنے کی صلاحیت خود بخود پیدا ہوتی رہتی ہے۔

جب یہ بات بخوبی ثابت ہو چکی کہ عالم مثال کی دید جادے دماغ اور اعصاب کی تیاری اور مستعدی پر منحصر ہے۔ تو آپ

چاہیں تو عوام الناس کے ساتھ تدریج قوائے دماغ میں ترقی کریں اور ہزاروں برسوں میں آہستہ آہستہ اس قابل ہوں کہ عالم مثال کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں یا چاہیں تو سخت محنت اور ریاضت کے ذریعہ سے جو سالکین راہ طریقت کا مسلک ہے جلدی اپنے دماغ اور اعصاب میں وہ استعداد اور ترقی پیدا کر لیں جو عالم مثال کے کھلنے کے لئے ضروری ہے اور اسی زندگی میں بعد الموت کی زندگی کا لطف اٹھائیں اور عالم آخرت اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ یہاں دونوں طریقے بتا دئے گئے ہیں۔ اب ناظرین کے اختیار میں ہے کہ وہ جس طرز کو چاہیں پسند فرمائیں۔

دماغ کی یہ ترقی کہ انسان عالم مثال کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرے کسی خاص مدت یا وقت کی طرف منسوب نہیں کی جاسکتی۔ یعنی کوئی عرصہ یا مدت اس ترقی کے لئے مقرر نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ترقی ہر شخص کی دماغی قابلیت اور استعداد پر منحصر ہے۔ جو لوگ خلقتاً عمدہ اور مستعد دماغ رکھتے ہیں انھیں عالم مثال ان اشخاص کی بہ نسبت جلد کھل سکتا ہے۔ جن کی دماغی ساخت بہت ہی اور ناقابل ہے۔ اگر ہم میں اس قدر صبر و استقامت ہو کہ ہم اس خیال پر قائم ہو جائیں کہ ہم اپنے آہستہ و دوہم جنوں سے راہ سلوک میں جلدی منازل طے کریں گے۔ تو اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اسی

مخبر ثبات کی وجہ سے عالم مثال کے اعلیٰ طبقے ایک دن ضرور ہم پر کھل جائیں گے۔ ہمارا ہی ضعف ارادہ اور ہماری ہی بے ثباتی اور عدم استقلال اس راہ سلوک میں سد راہ ہے۔

القلب خلاق الاشیا یعنی بہت بڑا بنیو الاشکون کا ہے

وہ اصل اصول جبر عالم مثال کی دید کی عمارت قائم ہے حسب ذیل ورج کیا جاتا ہے۔

روح کا ظہور جسم کی ترقی پر منحصر ہے۔ یعنی جسم کی ترقی

اور نمو کی بغیر قوائے روحانیہ کی کوئی کمالات ظاہر نہیں ہو سکتے

اس کا سبب کیا ہے کہ ہم سب کو عالم مثال کیون کھلا ہوا نہیں ہے۔ اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ ہمارے قوائے روحانی نے ابھی جزوی ترقی کی ہے۔ اور بعض قوائے روحانی تو ابھی تک ظاہر ہی نہیں ہوئے ہیں۔ اور اس لئے ہمارے دماغ اور اعصاب میں ترقی کی ضرورت بھی لاحق نہیں ہوئی ہے۔ اس زمانہ میں جس حد تک دماغ ترقی کر چکا ہے عوام الناس کے دماغوں کو وہ ترقی نصیب نہیں ہوئی۔ وہ اپنے دماغوں پر وزا بھی اس محنت اور ریاضت کا بار نہیں ڈالتے جو انکی ترقی اور ابھار کے لئے ضروری ہے

عوام الناس ابھی اس بات کو سمجھے ہی نہیں کہ دل بہت بڑا اخلاق
 افسیہ ہے یعنی وہی مختلف اشغال پیدا کرتا ہے۔ بھی قلب یا
 دل ہے جو ہمارے اعضائے جسم کو بناتا اور دماغ اور اعصاب کے
 تیار کرتا ہے۔ اس اصول کو عام طور پر لوگ نہیں سمجھ سکتے ہیں
 اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے دل کو کسی خاص طرف مصروف
 رکھنے کی قوت پیدا نہیں کرتے۔ ان کے دماغ میں مختلف اور
 کمزور خیال آیا کرتے ہیں اور کوئی با ترتیب اور قوی خیال قائم
 نہیں ہوتا۔ اگر ہم کسی اعلیٰ درجہ کے ترقی یافتہ اور قوی دل
 کی پوشیدہ کارروائیوں یعنی خیالات کو چشم بصیرت سے ملاحظہ
 کریں۔ تو ہم کو معلوم ہو جائے گا کہ کس طرح ایک زور دار قوی
 قلب سے زور دار خیالات کی موجیں دماغ میں آتی ہیں۔ اور
 کس طرح خیال کی قوت دماغی قوتوں کو بناتی یا پیدا کرتی ہے
 اگر ہم علم افعال الاعضا کی کسی عمدہ کتاب کو کھولیں اور
 اس میں دماغ کے ان سیلنز یا باریک غدودوں کو پڑھیں اور
 ان کی تصویروں اور نقشوں کو سمجھیں۔ تو ہمیں معلوم ہو جائیگا
 کہ ہر ایک سیل یا نہایت ہی چھوٹے غدود سے کئی شاخیں
 نکلتی ہیں اور ادھون نے بڑھ کے بھورے مادہ کا ایک
 جال سا پیدا کر لیا ہے۔ یہ باریک رگیں جو ایک دماغی غدود سے
 نکلتی ہیں۔ دراصل علاحدہ تار برقی کے تار ہیں۔ جب دماغ میں

ان غدد و دُن کی کثرت ہو جاتی ہے اور ان میں یہ تار قائم ہو جاتی ہیں تو کہا جاتا ہے کہ دماغ کی قوت بڑھ گئی۔

جب خیال کی موجیں ایک زوردار اور قوی دل سے نکل کر دماغ کے اس بھورے ماوے میں پھنچتی ہیں جس کو سلیز کا مجموعہ کہتے ہیں تو ان سلیز یا غدد و دُن میں تحریک پیدا ہوتی ہے اور وہ زیادہ شاخیں پیدا کرنے لگتے ہیں اور اس سے دماغ کی قابلیت اظہار خیال اور احساس و ادراک میں ترقی واقع ہوتی ہے۔ اس بھی یہ بات پورے طور سے ثابت تو نہیں کہ یہ سلیز یا غدد و دُن بھی بڑھتے ہیں۔ مگر اس بات کا امکان عام طور پر باور کیا جاتا ہے اسی اصول کی بنا پر یہ امر طے شدہ ہے کہ دل یا قوائے روحانی کے اکتساب اور باضابطہ ذکر و شغل سے دماغ کی قابلیت اور استعداد میں بہت کچھ ترقی ہوتی ہے۔ اور یہی اصول سالکین کو راہ سلوک میں زیادہ رہنما اور بکار آمد ہے۔ اور اسی اصول کے سمجھنے اور مشق و اکتساب سے عالم مثال کے اعلیٰ طبقات کھل جاتے ہیں۔

اسی کتاب افعال الاعضاء سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ ہر ایک قوت روحانی یا قلبی کے متعلق دماغ کے بھورے ماوے میں کچھ چھوٹا سا رقبہ سلیز کا موجود ہے۔ اور اسی بھورے ماوے کے ذریعہ سے ہر ایک مخصوص قوت قلبی کا ظہور ہوتا ہے۔

کہ ہم دو زبانیں جانتے ہیں تو ہمارے دماغ کے بھورے حصہ میں ایک زبان کے بولنے۔ اس کے لکھنے اور اس کے پڑھنے کا رقبہ پایا جاتا ہے۔ اس طرح دو نون زبان کے چھ رقبے ہمارے دماغ میں پائے جائیں گے۔ یہی حال ہر ایک قوت روحانی یا قلبی ہے کہ اس کے متعلق دماغ میں ایک مخصوص رقبہ ہوتا ہے مثلاً علم موسیقی تصویر کشی۔ نقشہ کشی۔ ریاضی وغیرہ علوم کے جدا جدا مرکز یا رقبے دماغ میں موجود ہیں جو ان علوم کے اکتساب سے نمو اور ترقی کرتے ہیں۔

جب ہم روح کی کسی خاص قوت کا اکتساب کرتے ہیں تو دماغ کا ایک خاص مرکز یا رقبہ جو اس قوت قلب سے تعلق رکھتا ہے پڑھنے لگتا ہے۔ اور اس قوت کے کمال کے ساتھ اس دماغی مرکز کے نمونین کمال پیدا ہوتا ہے۔ جب کوئی نیا علم یا اکتساب شروع کیا جاتا ہے تو دماغ کے مخصوص سیلز کے مجموعہ میں تغیر واقع ہوتا ہے اور اس بھورے مادہ میں ایک خاص پہاؤ ظاہر ہوتا ہے۔ جب تک ہماری طرف سے بالارادہ کوشش اور سعی عمل میں نہیں آتی اس وقت تک کوئی قوت دماغی کا ظہور نہیں ہوتا۔ اور دماغ کے بھورے سیلز میں کوئی تغیر و تبدل واقع نہیں ہوتا۔ اس لئے پھر ہم صاف طور سے بھی کہتے ہیں کہ قلب ایک قومی خلاق الاشیا ہے اور جب اسکی فونون کو ترقی دیتے ہیں پھنے

خیال کو کسی طرف لگاتے ہیں۔ تو اس وقت اس خیال کی ترقی کے ساتھ ساتھ مادہ و دماغ کو بھی ترقی ہوتی ہے۔

اصول تکرار۔ غلط ہے۔ آسان ہے

سالمکین راہ خدا کا طریقہ عمل بالکل علمی اور سائنٹفک ہے اور اس لئے اس میں ناکامی واقع نہیں ہوتی۔ بشرطیکہ کوئی عمل شوق اور صبر و ثبات سے کیا جائے۔ ان کے اشتغال اور اعمال اس اصول پر مبنی ہیں کہ جب کوئی فعل بار بار دہرایا جاتا ہے تو اس کی عادت ہو جاتی ہے۔ اور وہ طبعی اور غیر ارادی ہو جاتا ہے اسی طرح جب کوئی خیال بار بار کیا جاتا ہے تو وہ خلقی اور طبعی ہو جاتا ہے اور اخلاق موروثی کی فہرست میں داخل ہو جاتا ہے کسی خیال یا فعل کے بار بار دہرانے کو ہم اصول تکرار یا عادت کہتے ہیں۔

اگلے زمانہ کی کتب مقدسہ میں درج ہے کہ آدمی جس خیال میں رہتا ہے وہی ہو جاتا ہے۔ اور اس ہمارے زمانہ کے بڑے بڑے دانشمند دن اور صبحیان افکار کا بھی یہی مقولہ ہے کہ آدمی جو کچھ اپنے دل میں خیال کرتا ہے ویسا ہی ہوتا ہے۔ یعنی انسان کی شکل و صورت تو اُسے دماغی اور جسمانی بلکہ اس کو کامیابی ناکامی جو کچھ دنیا میں ہے سب اسی کے خیال پر منحصر ہے۔

اس کلیہ کی صداقت میں کسی کو شک و شبہ نہیں اور اسی پر دنیا میں تمام تعلیم و تربیت کی بنیاد قائم ہے۔ مال و دولت حکومت اور غزت۔ لباس اور فیشن یونیورسٹی کی تعلیم مدارس کے علم و ہنر کسی شخص کو انسان کامل بنا نہیں سکتے۔ انسان کامل اور مہذب وہ خود اپنے ہی احساس اور خیال سے بن سکتا ہے اور اسی کی محنت اور جانفشانی اس کو خدا تک پہنچا سکتی ہے اور اسی اصول عادت کے ذریعہ سے وہ تخلیق باخلاق اللہ کا خلعت خاص پہن سکتا ہے۔

مگر کوئی شخص اخلاق اور مقدس کتابوں کو پڑھ لینے اور ان کے اصول کو مان لینے سے سالک اور صوفی بن نہیں سکتا۔ صوفی اور اہل دل وہی شخص ہو سکتا ہے جو زندگی بھر ان مقدس اصولوں پر عمل و راہ کرتا رہے اور اس کے دل میں وصال حق اور اسرار حقیقت کے معائنہ کا ذوق و شوق ہو۔ وہ ان باتوں پر عمل کرتا ہے جنہیں لوگ کتابوں میں پڑھتے رہتے ہیں۔

سوالکین اس اصول عادت کو بالکل علمی اور سائنٹفک طرز استعمال کرتے ہیں اور اس سے پورے فائدے اٹھاتے ہیں۔ طہارت جسم تزکیہ نفس تصفیہ قلب اور تجلیہ روح میں اسی اصول کو لگاتے ہیں اور اس کی ادا دے ہر اکتساب و عمل میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اب ہم ذیل میں اس طریقہ کو بتاتے ہیں کہ کس طرح سوالکین اس اصول

عادت سے اپنے اشتغال اور اکتسابات میں کام لیتے اور کس طرح اپنے دل کو تربیت کرتے ہیں۔ اور اس اصول سے فائدہ اٹھاتے ہیں

ابتدائی مراتب یعنی طہارت جسم

ہمارا مادہ جسم بالکل عادت کا غلام ہے وہ نہایت ہی جلد ہر عادت کا تابع ہو جاتا ہے اور پھر اسی میں خوش رہتا ہے بعض اشخاص چار وقت بعض تین وقت۔ بعض دو وقت اور بعض دن رات میں ایک ہی وقت غذا کھاتے ہیں۔ بعض اشخاص سر سے پاؤں تک کپڑوں سے لڑے رہتی ہیں۔ اور بعض ایک کرتے اور تہ بند ہی پر اکتفا کرتے ہیں اور بعض بالکل ننگے رہتے ہیں بعض چھ گھنٹے محنت کرتے۔ بعض سولہ گھنٹے اور بعض بالکل بیٹھے اور پڑے رہتے ہیں یعنی کوئی محنت نہیں کرتے یہ سب اشخاص اپنی اپنی حالت میں خوش ہیں اور خلاف عادت سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔

جو لوگ اپنی باطنی قوتوں کو ترقی دینا چاہتے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ اپنی روزمرہ عادتوں کو احتیاط کے ساتھ جانچیں اور جو رسم و عادت خلاف اخلاق حمیدہ نظر آئیں یا جو راہ سلوک میں سد راہ ہوں انہیں چھوڑنے کی کوشش کریں اور مجاہدے اور ریاضت سے کام لیں۔

پست ہمت ہونا نہیں چاہیے۔ آہستہ آہستہ جسم کو اس تغیر غذا کا
 عادی کرنا چاہیے اور ایک کھانے کو بتدریج دوسرے کھانے کی
 جگہ قائم کرنا چاہیے۔ ایک قلیل ہی عرصہ میں تمہیں اس بات کو
 مشاہدہ کرنے سے تعجب ہو گا۔ کہ کس رغبت اور خواہش سے تم
 اس نئی غذا کو کھاتے ہو اور متروکہ غذا سے کس قدر متنفر ہو جاتے ہو۔
 شراب، سیندھ ہی اور ہر قسم کی منشی اشیاء سے اجتناب لازم تھا
 نہیں بلکہ واجب بھی ہے۔ شراب کا استعمال دو اتک میں کرنا نہیں
 چاہئے۔ یہاں اس بات کے کہہ دینے کی بھی ضرورت ہے کہ اگر
 سالکین کا طریقہ زندگی اختیار کیا جائے گا۔ تو وہاکی ضرورت ہی
 نہ پڑے گی اور امراض جسمانی ہی پیدا نہ ہوں گے۔ بلکہ صحت جسمانی
 اور قوت اعضائے جسم پورے طور سے حاصل ہو جائے گی۔ شراب
 اور دیگر منشی اشیاء کے استعمال سے دماغ کے نازک سلیز اور باریک
 ساختوں پر خراب اثر پڑتا ہے اور اس کے دائمی بلکہ وقتیا استعمال سے
 بھی دماغ کی وہ اعلیٰ قوتیں بگڑ جاتی ہیں جن کے ذریعہ سے روحانی
 ترقی حاصل ہو سکتی ہے۔ کیونکہ جب دماغ کا بھورا ناؤ بے حس
 ہو جاتا ہے اور اس میں سستی اور پستی واقع ہوتی ہے تو اس وقت
 عالم مثال کے بھٹکنے کی امید بالکل جاتی رہتی ہے۔

سچے اور یکے سالک اپنے ہر فعل بلکہ ہر خیال پر خواہ کیسا ہی حقیر
 کیوں نہ ہو ایک نگرانِ توجہ اور شخص کن نظر رکھتے ہیں۔ وہ اکثر اپنے

روزمرہ کے افعال اور خیالات کی جانچ پڑتال کیا کرتے ہیں۔ اور جو حرکات خراب معلوم ہوتی ہیں انہیں مجاہد سے اور ریاضت سے چھوڑتے جاتے ہیں۔ وہ اپنے دل ہی میں سے بُرے خیالات اور بری خواہشوں کو خار و اور خون کی طرح سے اکھاڑا کرتے ہیں تاکہ خصائل حمیدہ کی طاقت و زور میں خلل نہ آجائے۔ وہ اپنے جسم کو غسل اور طہارت سے پاک و صاف رکھتے ہیں اور اپنے اعضائے جسمانی کو بھی کسی مفید کام و ریاضت سے تندرست و صحیح رکھتے ہیں۔ وہ نہ ادنیٰ کپڑے پہنتے ہیں اور نہ لباس اتنا تنگ و چست کرتے ہیں کہ اعضائے جسم کے نمو میں کوئی روک پیدا ہو اور ان کی حرکات میں کسی قدر خلل واقع ہو۔

اس طرح مختلف طریقوں سے سالکین اپنی زندگی کے جسمانی رخ کی اصلاح کرتے ہیں اور اس ناسوتی اور مادی زندگی کو اصولِ فطرت الہی کے مطابق اور مناسب بناتے ہیں۔ اگرچہ انکی عادتیں اور طرز زندگی نہایت ہی سیدھے سادے اور سہل و سادہ ہوتی ہیں مگر ساتھ ہی اس کے ان کے فوائے جسمانی میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ اور وہ ضعف بدنی سے کابل اور مست نہیں ہو جاتے۔ غذا کے پرہیز کے ساتھ اس بات کا خیال بھی ہوتا ہے کہ مرید کے فوائے جسمانی اور صحت میں کوئی فتور واقع ہونے نہ پائی بلکہ برخلاف اس کے مرید کی طاقت اور صحت پورے طور سے قائم

رہے۔ اور اس کے ذہن اور دل میں کامل خوشی اور بشارت پائی جائے جیسے کہ دوپہر کے وقت آفتاب انتہائی عروج پر ہوتا ہو اور اپنی شعاعیں چاروں طرف پھیلاتا ہے۔ اسی طرح ایک سالک کے قلب کی حالت بھی ہونی چاہئے جس سے خوشی اور بشارت کے اثرات چاروں طرف پڑیں اور جو اسکی صحبت میں آئیں انکو دلون میں بھی تھوڑی دیر کے لئے خوشی اور سرور سرایت کر جائے اور دواویر کے لئے جو اہل دنیا اس کے پاس آئیں وہ دنیوی رنج و افکار سے نجات پا جائیں۔

روزمرہ کی زندگی میں دل کا تربیت کرنا

سچے سالک کو ضرور نہیں کہ وہ انسانوں کی صحبت چھوڑ کر جنگلون پھاڑوں پر جا کے بیٹھے اور وہاں اپنی روحانی ترقی کے اکتساب میں مشغول ہو۔ کیونکہ جو صفات حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ اور روحانی ترقی وہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ لوگوں کی صحبتوں اور تمدن کے حلقے میں رہ کر ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ معمولی آدمیوں کی طرح شہر و اور قصبوں میں رہنا۔ لوگوں کے ساتھ نشست و برخاست رکھنا لوگوں کی طرف سے جو سختیاں اور ناگوار باتیں واقع ہوں۔ انہیں بطیب خاطر برداشت کرنا قدرتی آفتوں اور مصیبتوں کو صبر و استقلال سے جھیلنا یہ سب وہ امور ہیں جن کے ساتھ سالکین راہ خدا اپنے

اشغال وادکار کو قائم رکھتے اور انسانی سوسائٹی ہی میں رہ کر تمام
منازل آخرت طے کرتے ہیں۔ ترک دنیا اس کا نام نہیں کہ مرید
سوسائٹی کو ترک کر کے حیوانوں کی طرح پہاڑ کے تنگ و تاریک
غاروں اور گنجان جنگل جھاڑیوں کے تنہا گوشوں میں بیٹھے۔

تمام اخلاق حمیدہ میں سب سے اول جو صفت قابلِ کشائش
اور جو تمام صفات نیک کی اصل کہی جاسکتی ہے وہ صفت بڑ
غرضی یعنی ایتار نفس ہے۔ جب طرح سے تمام اخلاق کی جڑ مہیہ
ایتار نفس اور بے غرضی ہے۔ اسی طرح تمام بد خلقیوں اور
برائیوں کی جڑ اس کا ضد یعنی خود غرضی ہے۔ دنیا میں جس قدر
جرائم بے رحمیان اور ایذا رسانیان اسوشت و کھائی و سے رہی
ہیں۔ ان کا اصل یہی خود غرضی ہے۔ دنیا کی ساری مصیبتیں
آفتیں اور درد و کھ اسے خود غرضی سے پیدا ہوئے ہیں۔

اگر انسان کے تمدن اور سوسائٹی پر ایک سرسری نظر
ڈالی جائے تو صاف ظاہر ہو جائے گا کہ بہت کم لوگ اس
مذموم صفت خود غرضی سے بچے ہیں۔ سب میں کسی نہ کسی
طرح تھوڑا بہت خود غرضی کا رنگ دکھائی دے رہا ہے۔ خود
غرضی سے بچنے اور ایتار نفس کی اعلیٰ صفت حاصل کرنے کا
یہ طریقہ نہیں کہ ہم اسکا افسوس کرتے رہیں کہ ہم میں یہ صفت موجود
نہیں بلکہ اس کے حصول کا دانشمندانہ طریقہ یہی ہے کہ ہم دوسروں کی

خدمت اور اعانت میں اس قدر سرگرم رہیں کہ ہم اپنے آپکو بھول جائیں اور اپنی ذاتی منفعت کا خیال بھی دل میں نہ آنے دیں ہمیں چاہئے کہ ہم ہر دم دوسروں کے نفع رسانی کی فکر میں غرق رہیں اور کسی در اسے ایسے موقع و محل کو بھی ہاتھ سے جانے نہ دیں جس میں دوسروں کی کوئی خدمت ہم سے ہو سکتی ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے لئے مختلف اسکیم اور طریقے سوچتے رہیں۔ اور وقتاً فوقتاً حسب موقع و محل نین علی صورتوں میں ظاہر کریں اس کی کوئی پروا نہ کرنی چاہئے کہ لوگ ہماری کاموں کو دیکھیں یا انھیں اچھا یا برا کہیں ہمیں اس کا خیال بھی نہیں کہ جو کام ہم نفع رسانی کے لئے کرتے ہیں وہ نہایت ادنی درجہ کا گو گوئی فائدہ کا کام حقیر ہو یا اعلیٰ۔ اس کی ذرا بھی پروا نہ کرنی چاہئے۔ ہر ہمیں اس کام کو محض حبثاً اللہ کرنا چاہئے اور اپنی نیت میں صرف فائدہ عام یا منفعت غیر کا خیال رکھنا چاہئے۔ اپنا ذاتی لگاؤ اس فعل میں ہرگز نہ ہو۔ مریضوں اور بیماروں کی خدمت کرو غزروں اور آنت زدوں کو بھی اپنی صحبت اور دم دلا سے سے تسکین دو۔ کمزور اور محتاجوں کی اعانت کرو۔ اور انھیں تقویت دو۔ اسی طرح ہر جگہ اور ہر وقت ایثار نفس کی کوشش کرتے رہو اور ہر لحظہ دوسروں کی خدمت و اعانت سے اپنی روحانی قوت کو بڑھاتے رہو۔ مگر جو کچھ ایثار نفس کے کام تم کرو وہ خوشی اور نجات سے

کرو اور اس میں کوئی بے عزتی اور بے آبروئی نہ سمجھو اور دلیں
 ہر دم یہی خیال رکھو کہ دوسروں کی خدمت سب عبادتوں میں
 افضل ہے اور اس کے بغیر کوئی شخص دنیا میں سچی خوشی حاصل
 نہیں کر سکتا۔ اور نہ نفس امارہ کے سخت پنجے سے چھوٹ سکتا
 مختلف و ردو ظائف قلب کو ایثار نفس کی طرف راغب کرتے
 ہیں مگر بغیر کتاب اور ریاضت یعنی بغیر عملی کارروائی کے یہ
 اعلیٰ درجہ کی فضیلت حاصل نہیں ہو سکتی۔

جب ہم اپنے ہمدردی انسانی کے فرائض جو ایثار نفس یعنی
 بے غرضی پر مبنی ہیں۔ بطیب خاطر روزانہ انجام دیتے ہیں اور
 دوسرے اشخاص کی زندگی کا بار اپنے کاندھے پر اٹھاتے ہیں
 اور ان کی حالت کو بہتر بناتے اور ان کو خوش کرنے کی کوشش
 کرتے ہیں۔ تو ہم اشیائے عالم کے دوسروں کی غائر نظر سے دیکھتے
 لگتے اور ان کے مقاصد ہمارے مقاصد اور ان کے احساس ہمارے
 احساس ہو جاتے ہیں اور اس طرح ہمارے دل میں مخلوق کی
 سچی محبت پیدا ہوتی ہے جو اصل غایت مرتبہ وحدت ہے۔
 اور غیریت کے قطع کرنے کے لئے ایک تیغ بران ہے۔ اس
 محبت سے ہمارے دل میں اخلاق حمیدہ اور فضائل پسندیدہ کی
 خواہش پیدا ہوتی ہے اور ہم سب بنی نوع آدم کو ایک جان آدم
 ایک قالب سمجھنے لگتے ہیں اور اس وقت توحید کے اسرار کا

انکشاف شروع ہوتا ہے جو اصل نجات اور سچا اسلام ہے۔ یہ وہی محبت ہے جس کے وجود سے بڑے بڑے اولیاء اللہ اور بہائم اور نے وصال حق حاصل کیا ہے اور فنا فی اللہ کا اعلیٰ مرتبہ پایا ہے۔ اسی سچی محبت۔ اسی بے غرضانہ خدمت اسی دانشمندان حکمت اسی خالصہ دہدہ روی میں سے بتدریج اندرونی الہام اور انکشافات کا سلسلہ قائم ہونے لگتا ہے اور روشن ضمیری اور تصرف ملک و ملکوت کی اعلیٰ قوانین حاصل ہوتی ہیں اور غیب کے اسرار کھلتے ہیں۔ کیونکہ سالک توحید کا عملی سبق سیکھتا ہے۔ جو یہ بتاتا ہے کہ عالم ہرہ دوست ہے۔ اور ماسوا اللہ کے کوئی شے موجود نہیں۔ اس عملی توحید کے بعد ہر شے میں سالک کو خدا ہی نظر آتا ہو اور ویدار آہی سے جس کی خبر قرآن شریف میں دی گئی ہے فیضیاب ہو جاتا ہے اسوقت قلنا تو لو قسم وجہ اللہ کی نظر بارید پیدا ہوتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر تم منہ پھیرتے ہو اور ہر خدا کا منہ ہے۔

جب یہ آگاہی اور وید سالک میں پیدا ہوتی ہے اور وہ دنیا کی ہر شے کی حقیقت کو دیکھنے لگتا ہے جو ہزاروں پروں میں چھپی ہوئی ہے تو اسوقت سالک کی نظر سے حجاب ظلمانی اُٹھ جاتے ہیں اور وہ پھر کسی شے سے وہو کا نہیں کھاتا اور کوئی اس کو فریب نہیں دے سکتا۔ شیاطین جن دانش کوئی اس کے اطراف آنے کی جرات

ہین کر سکتے۔

اس بعد رومی انسانی اوزار تیار نفس کے بعد دوسری وہ صفات
ہین جس کو بڑی احتیاط اور محنت سے حاصل کرنا چاہیئے۔ اس
صفت کو معمولی زبان میں سچائی اور اصطلاح طوفیہ میں صداقت
اور راستی کہتے ہیں۔ سالک کو چاہیئے کہ سچی بات منہ سے نکالے
اور جھوٹ سے سخت اجتناب کرے کیونکہ جھوٹ ایک گھرا
پر وہ ہے جو آدمی کے دل پر جھوٹ بولنے سے واقع ہوتا ہے۔
سالک کی زبان تعصب، عناد اور غیر واقعیت سے پاک و صاف
ہونی چاہئے۔ اور جو کچھ وہ بیان کرے یا زبان سے کہے پوری
سچائی اور واقعیت کی تصویر ہو۔ اس میں دیر بھی کسی مبالغہ اور تعصب
کی آمیزش نہ ہو۔ اور وہ ہمہ تن اپنی زبان اور اپنے کام اور اپنے
خیالات میں کامل صادق اور پورا سچا ہو۔ اور اس کا کلام اور
اس کے افعال ریا اور تصنع سے بالکل مبرا ہوں۔

ایثار نفس اور راستی کے بعد اور فضایل بھی ہین جن کا اکتساب
بھی سالک کے لئے ضروری ہے۔ ان میں سے بعض کے نام
ہم یہاں درج کرتے ہیں۔ ان کی تفصیل کی یہاں چند ان ضرورت
معلوم نہیں ہوتی۔ کتب اخلاق ان صفات عالیہ کے مفصل بیان
سے بھری ہوئی ہیں۔ ان ضروری صفات کے نام یہ ہیں۔ صبر
تواضع۔ علم۔ وفق۔ امانت۔ سخاوت۔ ہمت ارادہ وغیرہ۔

اگر ان سب اخلاق کی اصل قوت ارادہ ہے جس کا اکتساب ایک خاص طور پر کیا جاتا ہے۔ اگر ان صفات حمیدہ کو کوئی نفس کشی اور ریا سنت اور تجاہد سے حاصل کرے گا۔ تو تخلق باخلاق اللہ کا مصداق ہو جائے گا۔ کرنا بنی آدم کا خلعت خاص پہنے گا۔ اگر ہم پہلے ان اخلاق کے معنی سمجھ لیں گے۔ اور پھر صبر و استقلال سے ان پر عمل کرتے رہیں گے۔ تو کوئی شے مانع نہیں کہ ہم میں بے فضا کل پیدا نہ ہوں۔ صرف صبر اور ثبات و رکار ہے اور بہت اور شوق کی ضرورت ہے۔

توجہ یا ہمت یعنی خیال کو ایک ہی مرکز پر قائم کرنا

جب ہم کسی کام کو پوری توجہ کے ساتھ کرتے ہیں تو اس میں بے انتہا ترقی ہوتی ہے۔ کسی ایک شے پر خیال کو اس طرح جمانا کہ دل میں اس شے کے تصور کے سوا اور کسی شے کا تصور نہ آئے اس کا رروانی کو ہم توجہ یا ہمت کہتے ہیں۔ انسان میں یہ ایک اعلیٰ درجہ کی قوت ہے جس کے فائدے حد شمار سے خارج ہیں۔ خواہ کوئی شخص سالک ہو یا نہ ہو سب کو یہ قوت نہایت ہی بکار آ رہی ہے۔

دنیا کے ہر کام۔ ہر پیشہ اور ہر حرفہ میں یہی توجہ اور ہمت کامیابی کی جڑ ہے۔ جب کسی ایک بات یا مسئلہ پر پوری توجہ سے خیال جمایا

جاتا ہے اور ہمہ تن دل اس طرف رجوع ہو جاتا ہے تو وہ مسئلہ
گو کیسا ہی مشکل و دشوار ہو جلد حل ہو جاتا ہے۔ اس لئے وقف
کار اشخاص ایک ہی مسئلہ یا فن میں ایک وقت تک جب تک
کہ وہ تصفیہ نہ پائے اپنی توجہ کو مصروف رکھتے ہیں۔ اور کسی
دوسرے مسئلہ کو ہاتھ نہیں لگاتے گو وہ کیسا ہی مفید کیون نہ ہو
یہی وہ راز سر بستہ ہے جس سے دنیا میں لوگ ہر علم اور ہر فن
میں کامیاب ہوئے ہیں اور بڑی بڑی شہرت اور عزت حاصل
کی ہے۔ اور اس کے خلاف جہان پایا گیا ہے وہاں عمر بھر
بجز ناکامی کے اور کچھ ظہور میں نہیں آیا۔ اسی توجہ اور ہمت کو
اکتساب لئے یعنی ایک وقت میں ایک ہی کام کرنے کی عادت
لئے دنیا میں ہزاروں اشخاص کو اپنے مقاصد میں کامیاب
کر دیا ہے۔

اس اعلیٰ درجہ کی قوت توجہ کو حاصل کرنے کا صرف ایک ہی
راستہ ہے اور وہ مزا و ملت اور مداومت ہے۔ یعنی جس کام
اختیار کریں اسی کو صبر و ثبات کے ساتھ برسوں تک کرتے
رہیں اور دل کو اوہراؤ ہر متوجہ نہ کریں۔ اس جو اہر بے بہا کو کوئی
دوسرا شخص دے نہیں سکتا۔ یہ تو صرف اپنی ہی ذاتی محنت
و اکتساب سے حاصل ہوتی ہے۔ ایک مرشد یا پیرو اپنے مرید کو
اس قوت کے حاصل کرنے کا راستہ بتا سکتا ہے۔ مگر اس میں

اپنے تصرف سے اس قوت کو جہاں کر دینا بڑی ہی دشوار بلکہ تقریباً ناممکن ہے۔

مرغد مرید کے دل پر ایک حد تک توجہ ڈال سکتا ہے۔ مگر اس کو یہ قوت دے نہیں سکتا۔ خارجی حرارت سے لوہا گرم ہو سکتا ہے مگر جب آگ سے دور کیا جاتا ہے۔ تو پھر ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ یہی حال بعینہ مرشد کامل کی توجہ کا بھی ہے۔

اس توجہ کے حاصل کرنے کا سہل طریقہ یہ ہے کہ جو کام روزمرہ کرتے ہیں وہ پوری توجہ کے ساتھ کیا جائے۔ اور اس کو جہان تک ممکن ہو نہایت ہی غمگی اور بہت ہی دل وہی اور مہنر مندی سے کریں۔ کسی کام کے کرنے میں جلدی اور سستی اور بے پرواہی نہ کی جائے۔ غرض کہ جس کام کو کریں اس کو خوب سوچ سمجھ کر کریں۔ اور جہان تک ممکن ہو اسکو نہایت ہی خوبی اور تکمیل کے ساتھ انجام دیں اس طرح ہر وقت اپنے روزمرہ کے کاموں میں توجہ اور ہمت کا اکتساب اور عمل جاری رکھ سکتے ہیں۔

سالکین اور دنیا داروں دونوں کو تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے اس قوت توجہ کی ترقی سے انسان کو اپنے بے چین اور مضطرب دل پر حکومت حاصل ہوتی ہے۔ اور اس حکومت کے ساتھ وہ اپنے خیال پر پورا قادر اور متصرف ہو جاتا ہے اور اپنے اندر ایک ایسی زور و ارقوت پاتا ہے۔ جس کے بیان کرنے کے لئے ہماری

زبان میں الفاظ موجود نہیں ہیں۔

وہ دل جو تربیت سے پہلے ایک تاکند بچہ یا ایک طفل بے چین تھا۔ اب تربیب اور اکتساب کے بعد ایک شایستہ گھوڑا یا ایک مہذب آدمی ہے جو باگ کے اشارے پر یکسان قدم کے ساتھ چلا جاتا ہے اور ذرا بھی ہماری مرضی کے خلاف اُدھر ادھر نہیں ہوتا۔ اب ہم اس شایستہ قلب سے بڑے بڑے کام لیتے ہیں جنہیں اہل دنیا دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں۔

مراقبہ

اصول عادت سے سالکین بہت بڑے فائدے اٹھاتے ہیں اور اپنے دل کو قابو میں لانے ہی میں صرف اس اصول سے مدد نہیں لیتے بلکہ اپنے آپ کو تخلق باخلاق اللہ کے اکتساب میں بھی اسی سے امداد طلب کرتے ہیں اسی اصول تکرار اور مداومت اور مزادلت سے یہ تمام قوتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ دل کی توجہ کو ایک خیال پر یا کسی ایک مسئلہ علمی پر لگا دینے کو مراقبہ کہتے ہیں سب سے عمدہ مراقبہ تصورِ رشیخ ہے جس کو ایک مرشد کامل تفصیل کے ساتھ مرید کو بتا سکتا ہے۔

مراقبہ کا عام طریقہ یہ ہے کہ پہلی رات سے ایک تنہا مقام میں ہر روز بیٹھتے ہیں۔ خواہ یہ نشست دوزانو ہو یا چار زانو۔ اور اپنی

آنکھیں بند کر کے بائیں جانب قلب کے مقام میں تصور شیخ جہاتے ہیں یا قرآن شریف کی کسی ایک آیت پر غور و فکر کرتے ہیں۔ جہاں تک ممکن ہو اس وقت ایک ہی تصور ول میں رہے اور ایک ہی آیت کے متعلق خیالات آئیں۔ جب خیال دوسری جانب بہا کر تو پھر اس کو کھینچ کر اسی مقام پر لائیں۔ ہر روز اس شغل کے جاری رکھنے سے ایک مدت دزار کے بعد یکسوئی کی عادت پیدا ہوتی ہے مرید کو چاہیے کہ پہلی ناکامیوں سے برداشتہ خاطر نہ ہو جائے۔ اور اپنے اشغال کو چھوڑ نہ بیٹھے۔ اس کو چاہیے کہ بتدریج اس شغل کو بڑھاتا جائے اور کسی مسئلہ کا مراقبہ کرنے میں اس بات کا خیال رہے کہ اس کے متعلق اس قدر سوچے کہ اس کے تمام پہلوؤں پر غور پڑے تاکہ کوئی بات باقی نہ رہے۔ کسی مسئلہ کے سوچنے میں جلدی نہ کرے بلکہ اس کو مہینوں اور برسوں سوچتا رہے۔ تب اس کے اسرار باطنی سمجھ میں آئیں گے۔

جب تک کسی شخص کو ذاتی تجربہ حاصل نہ ہو جائے۔ اس وقت تک وہ اس بات کو کبھی باور نہ کرے گا کہ ایک قلیل وقت میں مراقبہ کے ذریعہ سے کیا قوت اور کیا علم اور کیا اسرار باطنی حاصل ہوتے ہیں جو عمر بھر کتابوں کی اوراق گردانی اور وعظ اور لیکچروں کے سننے سے بھی نصیب نہیں ہوتے۔ یہ چند منٹ کی توجہ کسی خاص امر یا مسئلہ میں وہ کام دیتی ہے جو برسوں مدارس کے سخت امتحانوں کے

پاس کرنے سے بھی روحانی کامیابی میسر نہیں ہوتی۔ اس متواتر مراقبہ سے نئے مناظر اور سمین ہمارے دل کی آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں جن کا مشاہدہ اور کسی تدبیر سے ہو نہیں سکتا۔ بعض اوقات عالم مثال کے بے انتہا خوبصورت مرد اور عورتیں اور باغ و مکانات اور وہ وہ خوشنارنگ ہمیں دکھائی دیتے ہیں جنہیں کوئی دنیا کا مصوٰ یا شاعر یا نثار اپنی ظاہری اور باطنی رنگ آمیزیوں سے لوگوں کو دکھا نہیں سکتا۔ بعض اوقات اشیاء عالم کی وہ باہمی نسبتیں ہمارے ذہن میں گزرتی ہیں جنہیں اہل فلسفہ اور حکمائے زمان برسوں خاک چھانٹیں تب بھی حاصل نہ کر سکیں۔ کبھی ہمارے دل میں آیات قرآنی کے ایسے معنی خود بخود پکے ہوئے پھل کی طرح ٹپک پڑتے ہیں جسے الہام کہتے ہیں کہ اگر علمائے ظواہر اور متکلمین صد ہا سال تک ان پر غور کریں تب بھی ان دُرے بہا کو نہ پائیں۔ جن باتوں سے ہمارے فرشتے بھی واقف نہ تھے وہ مراقبہ سے ایک آن واحد میں ہمارے دل میں بغیر سوچے سمجھے آجاتی ہیں۔ جو علم مراقبہ سے تنہائی میں حاصل ہوتا ہے وہ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے پر غور و غل کلاسوں اور لیکچراروں کے ٹیٹھٹھس بھرے ہوئے ہالوں میں نصیب نہیں ہو سکتا۔ یہ اعلیٰ درجے کے علوم و معارف بالکل سناٹے اور پوری خاموشی اور سکوت ہی میں منکشف ہوتے ہیں۔

کبھی ایک عمدہ خلق یا اچھی خصلت پر مراقبہ کیا جاتا ہے اور اس کا

طریقہ یہ ہے۔ مثلاً ہم صفت عدل کو ایک مضمون یا مرکز غور و فکر مقرر کریں اور اسی صفت پر ہر روز مبین وقت پر ایک ماہ تک غور و فکر تنہا مین بیٹھ کر کرتے رہیں۔ ہم کو یہ سوچنا چاہئے کہ عدالت کیا ہے اور اس کا فائدہ اور نتائج کیا ہیں اور اس کا ضدنا الضافی اور ظلم و نیا کو کیا نقصان پہنچاتا ہے۔ جب ہم عدل کے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح سوچ لیں تو پھر سب کے بعد ہمیں یہ خیال کرنا چاہئے کہ ہم ایک عادل آدمی ہیں اور اپنے تمام حرکات و سکنات اور روزمرہ کے کاروبار میں اعتدال کو نظر رکھتے ہیں اور اس صفت کے ساتھ لوگوں کے مجمع اور جلسوں میں پھرتے چلتے ہیں۔ ہماری بول چال۔ رفتار و گفتار اور عادات و رسوم سب میں اعتدال موجود ہے۔ گویا کہ ہم عدل کی مجسم تصویر ہیں۔ اس مراقبہ سے بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ جب صبح کے بعد ہم کاروباری دنیا میں مصروف ہوتے ہیں اور لوگوں سے ملنے جلتے ہیں۔ تو ہمیشہ عدل و انصاف اور اعتدال کا خیال رکھتے اور خود بخود ظلم سے ہمارا دل بھاگنے لگتا ہے۔ اور اس طرح جو کچھ ہم نے صبح کو سوچا تھا اس پر خود بخود عمل درآمد ہونے لگتا ہے۔ اور اعتدال کی صفت کے استعمال میں ہمیں پوری آسانی واقع ہوتی ہے۔ اسی طرح ہم اور صفات اور اخلاق پر مراقبہ کر سکتے ہیں جنہیں ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ہے ایک سہل طریقہ مفید مراقبات کا جنہیں خدا کامل اور مہاتما ریدن کو بتاتے ہیں اور اس طریقہ سے بتدریج

انسان میں جمیع اخلاق حمیدہ حاصل ہو جاتے ہیں اور وہ تخلیق باخلاق
 کا مصداق اور خلیفۃ اللہ کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرز
 مراقبہ سے رفتہ رفتہ سالک پر عالم مثال کے اعلیٰ طبقات کھل جاتی
 ہیں اور وہ اپنی باطنی نظر سے تمام عالموں کی سیر کرنے لگتا ہے۔
 اس قسم کے مراقبات سے مرید ہر قسم کی قوت اور اخلاق رفتہ
 رفتہ حاصل کر سکتا ہے اور اس کے دل کو کامل تربیت ہو جاتی ہے
 اور اس کے ساتھ ساتھ دماغ کی حالت بھی بدلتی جاتی ہے۔ اور
 اس کے سلیز اور ساخت میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ اور غذا کی پاکی
 اور جسم کی طہارت کے ذریعہ سے اور ان مراقبات کے وسیلہ سے
 آہستہ آہستہ دماغ میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ عالم مثال
 کی نازک نخر کیوں کو محسوس کرنے لگتا ہے اور اس میں اس غیر مری
 عالم کے نقشے اور تصویریں منطبع ہونے لگتی ہیں جنہیں ہم مراقبہ اور
 خواب کے بعد اچھی طرح یاد رکھتے ہیں۔

تصور شیخ

مراقبہ کی ایک اعلیٰ قسم تصور شیخ ہے اس مراقبہ سے ہمارے
 قلب و روح کی سب قوتیں ترقی کرتی ہیں اور ہم پر عالم مثال کے
 عالم جبروت اور دیگر عوالم ارواح کھل جاتے ہیں بعض مرشد مرید
 اپنا تصور بتاتے ہیں اور بعض کسی بہت بڑے ولی یا قطب کا تصور

کراتے ہیں جس کی تصویر یا صورت پائی جاتی ہے۔ بعض ہندو بدھا کرشن یا گرو کا تصور کرتے ہیں۔ اور بعض اشخاص خود اپنا یا اپنے کسی عزیز یا دوست کا تصور کرتے ہیں جس کے ساتھ انھیں محبت یا عشق ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک پیر کا تصویر سب سے زیادہ مناسب ہو۔ بعض مہاتما اور گرو کا تصور اس طرح کرتے ہیں کہ ان کے فضائل اور اعلیٰ درجہ کے اخلاق کو سوچتے ہیں۔ ان کا عدل و انصاف انکی ہمدردی انسانی۔ ان کا رحم و کرم۔ ان کی ریاضت وغیرہ سب صفات نظر رکھتے ہیں اور ان کے اخلاق اور عادات کا پورہ خاکا اٹلانے ہیں اور اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ جیسے وہ تھے ویسے ہی ہم بھی ہو جائیں۔ بعض اشخاص بڑے بڑے اوتاروں اور اقطاب زمان کی سوانح عمریان تلاش کر کے پڑھتے ہیں اور ان کے اخلاق و عادات پر غور کرتے ہیں اس مراقبہ سے رفتہ رفتہ ان اولیاء اللہ کی ارواح انکی امداد کرنے لگتی ہیں اور وہ خود فنا فی الشیخ کا مرتبہ حاصل کرتے ہیں جس کو عشق کہتے ہیں۔

بعض اشخاص تصور شیخ اس قدر چٹا کرتے ہیں کہ انھیں ہر چیز میں شیخ ہی دکھائی دیتا ہے اور جو ان سے کلام کرتا ہے اس کو شیخ ہی سمجھتے ہیں۔ فنا فی الشیخ اسی صوفی کو کہتے ہیں جس کو عالم میں بجز شیخ کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اس کے بعد فنا فی الرسول کا مرتبہ ہے اور اس کے بعد فنا فی اللہ کا۔ مگر یہ سچیلے دو مرتبہ اسی پہلے مرتبہ پر مرتب

ہیں۔ اور اصل مرتبہ وہ فنا فی الشیخ ہے جو سخت مجاہدوں اور بہت ریاضتوں کے بعد خوش قسمتی سے نصیب ہوتا ہے۔

مگر ہمیں عالم مثال اور عالم ارواح میں فرق کرنا لازمی ہے۔ کیونکہ نفس اور روح میں بہت بڑا فرق اور امتیاز ہے۔ روح کی وہ قوت جو مانع کے ذریعہ سے کام کرتی ہے مدد رک عالم مثال کہی جاتی ہے اور یہ قوت روح کا ایک اور اک خاص ہے جو بغیر مانع کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ مگر روحانیت خالص کا یہہ حال نہیں۔ عالم میں صرف ایک ہی ذات احد کو دیکھنا اور ماسوا اللہ سے انکار کرنا اعلیٰ درجہ کی روحانیت ہے جس کو وحدت یا توحید کہتے ہیں اس کل عالم کو صرف ایک ذات مقدس کا ظہور خیال کرنا اور ایسا تو لو قسم وجہ اللہ (یعنی جد ہر منہ کروا ہر اللہ کا منہ ہے) کی آیت کو سمجھنا اور اس پر عمل وراہد کرنا اسی کا نام فنا فی اللہ ہے اور یہی تمام ترقی کی معراج ہے۔

عالم مثال کا کھلنا

جب کوئی مرید اپنے مراقبہ اور مشاہدہ میں برسوں غرق رہتا ہے اور یہ اشغال روزانہ صبح کو کرتا ہے اور ہزاروں ناکامیوں پر بھی پست ہمت اور مایوس نہیں ہوتا ہے۔ تو آہستہ آہستہ اس میں یہ استعداد پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ جب تک چاہے ایک ہی

خیال کو دل میں قائم رکھ سکتا ہے۔ اور آخر کار وہ اس مرتبہ پر پہنچتا ہے کہ یہ خیال بھی دل سے محو ہو جاتا ہے اور ایک حالت نوم و لفظ کی پیدا ہوتی ہے۔ اس وقت نہ کوئی خیال اسکو کسی بیرونی شے کا ہوتا ہے اور نہ اندرونی چیز کا صرف ایک محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے جس میں اپنی ذات کا علم بھی نہیں رہتا۔ اس حالت میں روح یا آگاہی دماغ سے چلی جاتی ہے اور مرید اپنے آپ کو دفعتاً عالم مثال میں پاتا ہے۔ اور اس کے ہوش و حواس اس غیر مری دنیا میں ایسے ہی بر جا رہتے ہیں جیسے کہ اس عالم مادی میں تھے وہ اپنے حواس باطنی سے اس عالم کی چیز کو دیکھتا اور ادراک کرتا ہے یہ نوم و لفظ کی حالت اس وسیع آگاہی کا مقدمہ ہے جو روح کو حاصل ہے۔ یہ وہ حالت ہے جس کا انتظار سالک کو مدت و رات تھا جس کے حصول کے لئے اس نے ماتون کی نیند اور جسم کی حرکت ترک کر دیا تھا۔ عالم مثال کھل جانے کے بعد دماغ اور روح دونوں کی آگاہی ایک ہو جاتی ہے۔ اور چشمے اور سمندر میں ایک گہرا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر دماغ روح اور روح دماغ کہے جاسکتے ہیں اور دونوں ملکر ایک ہو جاتے ہیں۔

عالم مثال کے کھولنے کا ایک خاص طریقہ

ان طریقوں کے علاوہ جنہیں ہم بیان کر چکے ہیں عالم مثال کے

بہت جلد کھل جانا کا ایک خاص طریقہ بھی ہے جسکو ہم لکھ نہیں سکتے
 اور جس کی اشاعت کئی وجوہ سے ممنوع ہے۔ اس کتاب کی
 تکمیل کے لئے یہ ضرور ہے کہ ہم اس طریقہ کا ذکر اجمالی طور پر کریں
 مگر اس کی تفصیل تعلیم کا شایع کرنا نہایت ہی پرخطر ہے۔ اس طریقہ
 صرف مرشد کامل ہی کسی لایق مرید کو زبانی تعلیم کر سکتا ہے۔ اور
 جب کسی مرید میں اس طریقہ کے سیکھنے کی پوری استعداد حاصل
 نہیں ہوتی اسوقت تک اسکو کوئی مرشد کامل ملتا ہی نہیں ہے۔
 اس خاص طریقہ کی اشاعت جو نہیں کی جاتی ہے تو اس کا
 اصلی سبب کسی خود غرضی یا سخیل پر مبنی نہیں بلکہ خاص وجہ یہ ہے
 کہ اس کی تشہیر سے عوام الناس کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہی
 جس کی روک ضروری ہے۔ اگر کوئی نا اہل آدمی کسی تدبیر سے اس
 طریقہ کے عمل کو معلوم کر لے گا جو اس عمل کے اکتساب کے لئے
 علماً۔ اخلاقاً از روئے اتقا اور طہارت جسمانی کے تیار نہیں ہے
 اور پھر اس طریقہ پر عمل ورآمد بھی شروع کرے گا۔ تو وہ ضرور
 اپنے آپ کو ہلاک کر لے گا یا وماغی اور عصبی خرابی میں گرفتار ہو جائیگا
 یا ایک نہایت سخت عیاش اور ناقابل برواشت نفسانی آدمی ہو جائیگا
 کیونکہ غیر متقی آدمی میں اس طریقہ عمل سے اس قوت کا میلان اسفل
 کی طرف ہو جاتا ہے جو اس شغل خاص سے پیدا ہوتی ہے اور پھر
 یہ عامل اس قوت کو اپنے قابو میں رکھ نہیں سکتا۔

اس خاص طریقہ کے عمل سے جس کو نہایت ہی مختصر الفاظ میں ہم
 بیان بیان کرتے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے قوائے مثالی نمو کرتے ہیں
 اور ان کے نمو سے ایک نہایت ہی پر زور قوت پیدا ہوتی ہے
 جس کو کنڈلنی یا اتشی سانپ کہتے ہیں اور جو ریڑھ کی ہڈی کے تلے
 ہر آدمی میں پائی جاتی ہے۔ جب یہ قوت ایک مرتبہ چونک جاتی ہو
 اور اس کو ایک مناسب اور اعتدالی طور پر کسی خاص طرف لگایا
 جاتا ہے۔ تو اس وقت وہ زور کے ساتھ نیچے سے اوپر کی طرف
 صعود کرتی ہے اور جسم کے مخصوص چکرون کو زندہ کرتی اور تقویت
 دیتی ہے۔

یہ مرکز یا چکر جن کا طول و عرض دو انچ تک ہوتا ہے۔ انجن کے
 گھومتے ہوئے پیہون یا حلقوں کی طرح ہوتے ہیں یہی چکر ایک
 طرح کی نہرین ہیں جن کے ذریعہ سے عالم مثال کی فورس یا قوت
 وماغ اور اعصاب تک پہنچتی ہے۔ یہ مرکز یا چکر ایتھریل جسم میں
 پائے جاتے ہیں اور ان کے خاص مقامات یہ ہیں۔ ریڑھ کی ہڈی
 کی اسفل جڑ طحال۔ ناف۔ قلب۔ یا ول۔ حلق۔ وولوا بر وون کے
 بیچ کا مقام۔ سر کے اوپر کا حصہ یا چوٹی۔

جب ان مرکزون یا چکرون کے ذریعہ سے کنڈلنی یا اتشی سانپ
 چومکایا جاتا ہے اور یہ قوت زور کے ساتھ ان مرکزون سے نکلتی ہے
 تو اس وقت یہ مرکز عالم مثال کی تحریکوں کو محسوس کرنے لگتے ہیں اور

طالب پر عالم مثال پورے طور سے کھل جاتا ہے۔ مگر ہر شخص کو مرکزوں کی حالت مختلف ہوتی ہے اور اسی وجہ سے مرکزوں کی قابلیت اور اسبقہ او کا لحاظ بھی رکھنا پڑتا ہے۔

لیکن اگر مرید یا طالب ہوائے نفسانی اور خواہشات شہوانی سے پاک نہیں ہے اور اگر اس نے عورت کے پاس جانے سے قسطنی پرہیز نہیں کیا ہے۔ تو ایسی صورت میں اس عمل سے اس کو شدید نقصان آید حال ہونے کا یقین کامل ہے۔ کیونکہ اس صورت میں یہ آتش سانپ اوپر جانے کی عوض نیچے کی طرف آئے گا اور اس کی قوت شہوت یا عورتوں کی خواہش اس قدر شدید ہو جائے گی کہ وہ نہایت ہی سخت جرائم شہوانی کا مرتکب ہو جائے گا۔ اور وحشیانہ سو وحشیانہ افعال اس سے صادر ہوں گے۔

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اس خاص طریقے سے بہت جلد اور آسان طور پر عالم مثال کھل جاتا ہے۔ مگر چونکہ اس طریقہ میں عورت کے پاس جانے کی سخت ممانعت ہے اور خواہشات شہوانی کا کامل پرہیز ہے۔ اس لئے اس شغل کی جرات ہر شخص کو کر فی نہیں چاہئے اگر اس شغل کا کوئی سچا طالب ہے۔ تو اس کو چاہئے کہ کسی مرشد کامل کو تلاش کرے۔ کتابوں میں اس سے زیادہ لکھنے کی اجازت نہیں مگر ہماری خاص رائے تو یہی ہے کہ مرید کو چاہئے صبر و ثبات سے طریقت کی شامح عام پر چلے اور اتقا۔ مراقبہ اور مشاہدے کے ذریعہ

بغیر کسی خوف و خطر کے منازل باطنی طے کرے۔ اور بتدریج عالم مثال کے طبقات کی سیر کرے۔ آخر میں یہ ضروری ہدایت قابل تاکید ہے کہ ان تمام اذکار اور اشغال میں روزانہ اکتساب کی بہت ضرورت ہو۔

فصل ۹۔ فتا فی اللہ اور تقابا باللہ

کوئی مرتبہ بلند ایسا نہیں ہے کہ انسان اسکی خواہش کرے اور اپنی ارادے میں پیغمبر ہو جائے اور وہ اسے نصیب نہ ہو۔ انسان میں قوت ارادہ ایک ایسی اور وار قوت ہے جس سے ہر ناممکن شے بھی ممکن ہے کیونکہ ہمارے اندر حضرت حق جلوہ کرہین اور اس ربانی وجود میں جمیع اسماء و صفات موجود ہیں اور ہر قسم کی قوت اس میں مخفی ہے۔ یہ ہماری کمزوری یہ ہمارا نقص یہ ہماری جہالت یہ ہماری پست ہمتی سب ہماری جسم سے پیدا ہوتی ہے جس میں یہ وجود ربانی مقید ہے۔

یہ دنیا ایک مدرسہ ہے جہاں ہم صد ہا زندگیوں علم اور تجربہ حاصل کرنے میں گزارتے ہیں اور بتدریج اس جسم پر حکومت کرنا اور اس کو قابو میں لانا سیکھتے ہیں اور اس کشیف مادے کو اپنی قوت ارادے کو ماتحت کرتے ہیں۔ ایک زمانہ میں ہم ہی وحشی آدمی تھے اور جنگلون جھاڑوں میں درختوں کے پتے اور جڑیں کھاتے پھرتے تھے۔ صد ہا جنموں کے بعد ہم میں تہذیب و شائستگی پیدا ہوئی ہے اور اب ایک وہ زمانہ آنے والا ہے کہ ہم ہی حضرت حق کی درگاہ مقدس کے فرشتگان عرش اعلیٰ اور مقربان

خداوند تعالیٰ ہو جائیں گے۔

وحشت کے ادنیٰ درجہ سے نندن کی اعلیٰ معراج تک جو تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں اور ہوتی جاتی ہیں وہ دراصل روح میں نہیں ہوئیں جس سے انما یا ہم تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ ساری تبدیلیاں اور یہ تمام ٹھنڈا جسم میں واقع ہوتے ہیں۔ ترقی اور نمو خارج جسم سے نہیں آتی اور کوئی قوت باہر سے اگر ہمارے اندر گھس نہیں جاتی بلکہ تمام ترقیاں اور ساری قوتیں ہمارے ہی اندر غفلت کی حالت میں موجود ہیں۔ جب وہ اس غفلت سے بیدار ہوتی ہیں۔ تو ترقی اور نمو کی مصداق ہو جاتی ہیں۔ اور اسی نگار وانی کو ہم ترقی اور نمو کہتے ہیں جب وہ بہت بڑا استوار تجربہ یا علم ان اندرونی قوتوں کو دوران حیات عالم ناسوتی میں پیدا کرتا ہے۔ تو یہ قوتیں پہلی دفعہ کو بلون کی طرح نمودار ہوتی ہیں اور خود غرضی نفسانیت اور حیوانیت کے مختلف سیاہ اور سنگین پروں میں اپنی چٹکاسی طرح دکھائی ہیں۔ جس طرح کہ ایک شمع کی روشنی کثیف اور میلے آئینوں میں سے نظر آتی ہے۔

مگر جب ہم سیکے بعد دیگرے اپنی قوتوں کو ابھارتے اور انھیں ترقی دیتے ہیں اور ہر خلق حسنہ سے اپنے آپ کو آراستہ کرتے ہیں۔ تو اسوقت ہم تخلیق باخلاق اللہ کے مصداق ہو جاتے ہیں اور ہمارے اندر سے آفتاب وحدت چمکنے لگتا ہے اور اپنی شعاعیں اور نور اس جسم کے باہر ڈالنا شروع کرتا ہے اور چارے حواس ظاہری اور اک باطنی کے مطابق ہو جاتے ہیں اسوقت اس حدیث شریف کا مضمون ہم پر صادق آتا ہے کہ خلق آدم علی صورتہ

یعنی حضرت آدم (الانسان) خدا کی صورت پر پیدا کئے گئے ہیں جب ہم میں
خدا کی صورت ظاہر ہو جاتی ہے۔ تو اس وقت ہم زمین پرانی جاہل فی الاخر،
غلیفہ (ہم نے آدم کو زمین پر اپنا جانشین بنایا) کے مستحق ہو جاتے ہیں اور
اس وقت تمام ملائکہ ہمو سجدہ کرتے ہیں اور جو ہمارے سجدے سے انکار
کرتا ہے وہ ابلیس ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے۔
وَ اذ قلنا للملائكة السجدوا لآدم فسجدوا الا ابليس و استکبر و کان من الکافرين
یعنی ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو اور انھوں نے اس کو سجدہ
کیا۔ مگر ابلیس نے نہیں کیا اور انکار کیا اور غرور کیا۔ اس لئے وہ کافر و نمین
داخل ہو گیا۔ جب ہم معراج کمال انسانی پر پھٹتے ہیں اور ہم میں خدا کی
ہر صفت اور قوت ظاہر ہوتی ہے اور ہم تمام زمین اور آسمان کے طبقات
کھل جاتے ہیں اور ابدی اور ازلی اشیا کا علم یعنی لوح محفوظ کا علم ہمو برائے
العیین ہو جاتا ہے تو ہم پر الہام یا وحی نازل ہوتی ہے اور اس وقت خود
حضرت حق اس قالب جسمانی میں جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ اور اس وقت
آخری معراج ہمو نصیب ہوتی ہے۔ جسکو صوفیہ کرام کی اصطلاح میں
مرتبہ انا کہتے ہیں۔ یہ وہی مرتبہ انا ہے جو سب سے پہلے ہمارے رسول
مقبول کو حاصل ہوا تھا۔ اور اسی کو زبان شرع میں معراج سے تعبیر کرتے
ہیں۔ اس لئے اس امت محمدی کی نسبت خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے
و انتم خیر امتہ اخرجت للناس۔ یعنی تم سب سے زیادہ بہتر قوم یا جماعت ہو
جو خلق اللہ کی تعلیم و ہدایت کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔ اس وجہ سے رسالت

ختم ہو گئی کہ اب مرتبہ توحید میں اضافہ کی گنجائش نہیں رہی۔ کسی پیغمبر نے توحیدِ افعالی کی تعلیم دی اور کسی نے توحیدِ صفاتی کی اشاعت کی مگر ہمارے خاتمِ الرسل حضرت محمد صلعم نے ہمیں توحید و جو دی بتائی جو انتہائی مقام وحدت ہے۔

اس لئے ہر شخص کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ اپنی روحانی ترقی کو اپنی دنیوی کاروبار کے ساتھ قائم رکھے اور کسی وقت اس مقصودِ حیات نہ چھوڑے۔ حضرت حق کا نور اور جلوہ ہر دل میں موجود ہے کوئی آدمی خواہ وہ عورت ہو یا مرد۔ ہندو یا مسلمان۔ وہیڑ ہو یا چار اس جلوہ حق ہی خالی نہیں۔ خواہ بچے ہوں یا بوڑھے۔ پاک ہوں یا ناپاک جاہل ہوں یا عاقل سب میں یہ خدا کے نور کی چنگاری پائی جاتی ہے۔ صرف اس کو دہکالنے اور بار بار پھونکنے کی ضرورت ہے۔ یہ آتش عشق نہاؤسے ہی اندر موجود ہے کہیں باہر سے نہیں آتی۔ اس لئے ہمت کرنا نہیں چاہئے۔ ہر کام اور ہر پیشہ اور ہر حالت میں خدا کا ذکر اور اپنی روحانی ترقی کی فکر ہو سکتی ہے۔ اگر تم اس وقت گمراہ ہو۔ کچھ مضائقہ نہیں۔ بہت نہ پست کرو۔ زور خود آجائے گا۔ اگر تم ہزاروں غمناک کام ہو تو بھی شغلِ روحانی کو نہ چھوڑو اس کا نہ چھوڑنا ہی کامیابی ہے۔ اگر تم بالفضلِ نوجوان اور نادان واقف ہو۔ بہت قائم رکھو اور خدا کا ذکر نہ کیے جاؤ اور صبر و ثبات سے کام لو۔ دانشمندی اور علم خود آجائیں گے۔ دل کو ہمیشہ خوش رکھو امید کو پست نہ کرو۔ اور جہان تک وقت مل سکے روح کی ترقی کو

لئے کچھ نہ کچھ کرتے رہو۔ اگر خدا نخواستہ تم پر کوئی رنج و غم حادثہ یا مصیبت طاری ہو۔ تو یہ دریافت کرو کہ اس سے ہمیں کیا روحانی سبق حاصل ہو سکتا ہے اور صبر اور تسلیم و رضا پر ہم اس وقت کس طرح عمل پیرا ہو سکتے ہیں اگر ہم کو عیش و آرام اور دنیاوی کامیابیاں نصیب ہوں۔ تو ہلکے چاہو کہ ہم اپنے بھائیوں کو بھی ان میں شریک کریں اور انھیں بھی ان سے فائدہ پہنچائیں۔ یاد رہے کہ ہمارا کرہ ارض خدا کے دل میں گردش کھا رہا ہے اور وہی ہمارے اطراف و جوارب محیط ہے۔ اسی کے بے حد رحم و کرم و فضل و احسان اور عقلمندی پر ہماری زندگی کا دار و مدار ہے۔ جب تم کو اس بات پر یقین کامل ہے تو اب تم کو کسی چیز سے خوف بے فائدہ ہے اور تنہا رنج و غم یا یوسی اور ہر اس سبب بے اصل و ہم و خیال ہیں ہمیشہ اپنی نظر کو اس خدا کی طرف جمائے رکھو جو کبھی تنہا ہی انگوٹھ سے غائب نہیں ہوتا۔ وہ ازلی اورابدی ہے۔ وہی پیدا کرتا۔ پرورش کرتا اور مارتا ہے اس کے سوا کسی سے کوئی امید رکھنا نہایت ہی سفاہت اور جہالت ہے۔ جو لوگ اس دنیا کے تلاطم میں ایک نا خدا کی طرح قطب حق پر نظر رکھتے ہیں اور ہر حالت میں اپنے کاموں کو اس کے سپرد کر دیتے ہیں وہ اس طوفان دنیا کی ہلاکت سے محفوظ رہتے ہیں اور ان کی کشتی عمر اس سحر ہلاکت سے ہال ہال بچ جاتی ہے۔

خاتمہ کتاب پر ہم اس قدر لکھنا اور ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اس قدر دنیا میں انہماک اور اشتغال رکھتا ہے کہ وہ دو ایک گھنٹے بھی

عبادت الہی میں بغرض ترقی روحانی مصروف رہ سکتا تو وہ سخت خوف
و خطر میں ہے اور اس کی یہ حالت خطرناک اور قابل افسوس ہے خدا ایسی
غافل اشخاص کو بیدار فرمائے اور انھیں اس عذاب الیم سے نکالے جو
مارا ہجر سے تعبیر کیجا سکتی ہے۔

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ

ملاقات
محبت حسین

المرقوم ۲۳ ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ

اسٹریٹ حسین عابدی - ایم اے -
پتہ لاہور -

ایم ایس اے

